سوغات

سہ ماہی

مدیر:- محمود ایاز

فی پرچہ:- دو روپئے

فون نمبر ۷۱۹۸۶

سہ ماہی

سوغات

دوسرا شمارہ

مدیر
محمود ایاز

قیمت
۲ دو روپے

پتہ
۲۷ کلائن روڈ بنگلور ۵

دوسرا شمارہ

مقامِ اشاعت ۲۷، کلائن روڈ بنگلور ۵

طباعت پاسبان برقی پریس بنگلور ۱

قیمت فی پرچہ دو روپے ۔ سالانہ آٹھ روپے

نوٹ

خریداروں کو پرچہ بُک پوسٹ کے ذریعہ روانہ کیا جاتا ہے جو حضرات سالانہ چندہ کے ساتھ رجسٹری کا بھی خرچ بھی روانہ کریں گے۔ ان کو پرچہ بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ بھیجا جائے گا۔ بصورت دیگر ادارہ پرچہ کی عدم وصولی کی ذمہ داری نہیں لے سکتا

فہرست

نقشِ اوّل صفحہ ۵ تا ۱۰

مضامین

افسانے

نظمیں

غزلیں

تبصرے ★ ——— ★ محمود ایاز

بازگشت

نقشِ اوّل

آئن سٹائن سے ایک مرتبہ استفسار کیا گیا تھا کہ تیسری عالمگیر جنگ کن ہتھیاروں سے لڑی جائیگی. آئن سٹائن نے جواب دیا "مجھے علم نہیں تیسری جنگ کن ہتھیاروں سے لڑی جائیگی. لیکن چوتھی جنگ کے بارے میں مجھے یقین ہے وہ پتھروں سے لڑی جائے گی"

اس جواب میں آتمی جنگ کی مکمل تباہکاریوں اور انسانی تہذیب و تمدن کے ملیامیٹ ہوجانے کے جس خطرے کی طرف اشارہ کیا گیا تھا وہ دن بدن نمایاں تر ہوتا جارہا ہے. لیکن اگر بیحد خوش اعتقادی اور رجائیت پسندی سے کام لے کر تیسری عالمگیر جنگ کے امکان کو نظرانداز بھی کردیا جائے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اپنے خودساختہ معاشی اور سیاسی نظاموں کے ہاتھوں ایک خودکار مشین کی حیثیت اختیار کرتا ہوا جدید انسان کرۂ ارض پر کس قسم کی زندگی بسر کریگا!

موجودہ دور کی بے یقینی، ذہنی نراج. انتشار. اعصاب زدگی. میکانکی طرز حیات. انسانی اقدار کا انحطاط. رشتوں اور تعلقات میں کسی تقدس کا فقدان انسان کو جس انجام کی طرف لے جارہا ہے وہ آتمی جنگ کی ہلاکت آفرینیوں سے کہیں زیادہ خطرناک ہے.

آج سوال صرف ادبی اقدار کے انحطاط اور ادب میں جمود کے ماتم کا نہیں بلکہ ان مظاہر کے پس پشت انسانی اقدار کے زوال کے جو محرکات کارفرما ہیں. ان کی تشخیص اور چارہ گری کا ہے. آج فضا میں نئی کائناتوں کی تلاش کی بجائے انسان کو اس کی کھوئی ہوئی انسانیت واپس دلانے کی مہم زیادہ اہمیت رکھتی

ہے۔ اور یہ کام سائنس دانوں اور سیاست دانوں کے بس کا نہیں ہے۔ اس بار ک
اٹھانے کے لئے فنکاروں اور دانشوروں کے شانوں کی ضرورت ہے۔

آج انسان کو آئینہ میں اس کے مسخ شدہ خدوخال دکھا کر بھی کوئی نتیجہ
نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ابھی مسخ شدہ صورت کو انسان اپنی اصلی شکل سمجھنے لگا ہے۔
تک اس کے سامنے اس کے کھوئے ہوئے خدوخال کی تصویر نہ ہو وہ موجودہ
شدہ صورت کی ہیبت اور دہشت کو محسوس نہیں کر سکتا۔ آج صرف آئینہ بتانے
مشاطگی سے کام نہیں چل سکتا۔ بلکہ خال کی تاریکی کو مستقبل کی روشنی میں بدلنے کے لئے ما
کی انسانی روایات کی بازیافت کی جوت بھی جگانی ہو گی۔ اور یہ کام آج دنیا کے
کے شاعروں۔ ادیبوں۔ آرٹسٹوں اور دانشوروں کے کرنے کا ہے۔

اس ضمن میں "سوغات" کے دو مضامین خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ایرش فر
نے اپنے مضمون میں جن بنیادی باتوں کی طرف اشارے کئے ہیں ان کے نتائج سے بحث
ڈاکٹر محمد حسن کے مضمون میں ہوئی ہے۔ یہ دونوں مضامین ہمارے ادیبوں سے غور
فکر کے متقاضی ہیں۔

محمد حسن کے مضمون میں بعض باتیں تشنہ رہ گئی ہیں۔ دو ایک جگہ ان
اخذ کردہ نتائج سے ہلکا سا اختلاف بھی ممکن ہے۔ مثلاً کردار اور شخصیت کا
فکر کی دورنگی سے کہیں زیادہ ایک مربوط فلسفۂ حیات اور اخلاقی نظام
کے فقدان کا نتیجہ ہے۔ فکر کی دورنگی خود اس فقدان اور اقدار کے غلط شعور
نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اس سے قطع نظر اس مضمون میں جو سوالات اٹھائے
گئے ہیں۔ اور جن باتوں کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے وہ بیحد فکر انگیز ہیں۔

جمیل جالبی نے پیاسترناک کی شاعری پر لکھتے ہوئے تمہیداً شاعر اور ادیب
آزادی کے بارے میں بہت سچی باتیں کہی ہیں۔ اس دور میں فکر و اظہار کی آزاد
کو ہر معاشرے میں خطرے لاحق ہیں۔ خواہ وہ مطلق العنان ریاست ہو یا سرمایہ دا
جمہوریت دونوں جگہ حق گوئی و بیباکی سے کام لینے والوں کو دار ورسن

کی آزمائش سے معذرہیں۔ پیاسٹرناک کے ناول پر سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے جو ہنگامہ آرائی ہوئی اس کے شور و شغب میں پیاسٹرناک کی ادبی اور شاعرانہ شخصیت نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ اس لحاظ سے بھی جیل جالبی کا مضمون مفید اور اہم ہے۔

★

سماجی زندگی کے میکانکی تعلقات اور جبالی سطح پر قائم ہونے والے رشتوں سے بلند ہو کر فرد اور جماعت فرد اور فرد، فرد اور کائنات کے درمیان ایک زندہ رابطہ برقرار رکھنے کے لئے چند مشترک بنیادی تصورات اور عقائد ناگزیر ہوتے ہیں۔ موجودہ دور میں تصورات اور عقائد کا یہ نظام دنیا کے ہر معاشرے میں تہس نہس ہوگیا ہے۔ بعض معاشروں میں یہ زوال مکمل ہو چکا ہے۔ اور بعض میں تکمیل کے قریب۔ ہمارے ہاں بھی شکست و ریخت کا یہ سلسلہ اپنے پورے آثار و نتائج کے ساتھ ظہور پذیر ہو چکا ہے۔ مگر گذشتہ چند ایک دنوں سے ہمارے بعض اہل فکر اصحاب کا خیال ہے کہ ہمارے ممالک (ہندوستان اور پاکستان) کے مسائل بیرونی ممالک کے مسائل سے بہت مختلف ہیں۔ کیونکہ ابھی یہاں خدا اور مذہب سے عقائد اور روایات سے عام آدمی کا رشتہ برقرار ہے۔ اس لئے جو لوگ یہاں ذہنی بزاج۔ بے یقینی اور روح کی موت کی باتیں کرتے ہیں۔ وہ دراصل خواہ مخواہ شہر کے اندیشے میں دُبلے ہوئے جا رہے ہیں۔ کیونکہ یہ تو ان سمندر پار ممالک کے مسائل ہیں!

بظاہر یہ بات بہت معقول معلوم ہوتی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ بہت بڑی خود فریبی ہے۔ اگر یہ بات ان عوام کو پیش نظر رکھ کر کہی جا رہی ہے جو آج بھی مذہب اور اعتقادات کے نام پر جاہلانہ رسوم اور توہم پرستی کا شکار ہیں۔ اور جو سرمایہ دارانہ نظام کی نحوستوں اور برکتوں سے اپنے تعلیم یافتہ ہم وطنوں کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ محفوظ ہیں۔ تو پھر اس سادگی کے جواب میں خاموشی

ہی بہتر ہے۔ ورنہ ہمارے ہاں اس طبقہ کے افراد کا کیا حال ہے جو کسی
بھی ملک کی ذہنی قیادت کرتا ہے؟! اقبال نے مغرب کے جس نظام
فکر کے خلاف اعلانِ جنگ کیا تھا اس کا وجود اور اس کا دائرہ اثر اگر
مغربی ممالک تک محدود ہوتا تو شاید اقبال کی شاعری کچھ اور ہی نہج
ہوتی۔ یہ بجا کہ ہمارے ہاں ابھی صحیح معنوں میں صنعتی دور کا مکمل ظہور
بھی نہیں ہوا۔ لیکن بیرونی ممالک میں صنعتی انقلاب کے ساتھ جو فکری انقلاب
پیدا ہوا وہ ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کو مکمل طور پر متاثر کر چکا ہے۔ ہم لوگ
کی پیدائش کہیں کی بھی ہو لیکن ہماری ذہنی نشوونما مغرب کے فکری ماحول
میں ہوئی ہے۔ آج ہندوستان اور پاکستان کا اہلِ فکر طبقہ کم و بیش انہیں مسائل
سے دوچار ہے جو مغرب کے سوچنے اور سمجھنے والوں کو پیش آ رہے ہیں
ظاہر ہے ہمارے یہاں حالات کئی ایک باتوں میں مختلف ضرور ہیں۔ لیکن بنیادی
طور پر ہمارے ان کے مسائل میں بہت بڑا فرق نہیں ہے۔ اور پھر اس خوش فہمی
میں بھی ہم کب تک مبتلا رہ سکتے ہیں کہ ہمارے کروڑوں عوام ابھی اعتقاد اور
یقین سے محروم نہیں ہوئے؛ ہم لوگ جس قسم کے معاشی اور سیاسی نظام میں
زندہ ہیں اور جن کو زندہ رکھنے میں مدد دے رہے ہیں۔ ان کا لازمی اور حتمی
ارتقا تقریباً وہی نتائج پیدا کرے گا۔ جو یورپ میں ایک صدی پہلے پیدا
ہو چکے ہیں۔ بشرطیکہ یہاں اس ارتقاء کے تکمیل پا سکنے تک انسان نے ساری دنیا
کو ایک تباہ کن جنگ کا ایندھن نہ بنا دیا ہو۔ تو غرض حاصل مطلب یہ ہے
اس وقت ہمارے ہاں سوچنے اور سمجھنے والے طبقے کے افراد اسی ذہنی
مزاج سے دوچار ہیں جو اس وقت دنیا بھر میں عام ہو چلا ہے۔ اشتراکیت
نے تھوڑی دیر کے لئے اس بے یقینی اور انارکی کی لہر کو روکنے میں مدد دی
دی۔ لیکن بہت جلد اس فصیل میں بھی رخنے پڑ گئے اور آج کمیونزم میں ایک ...
تصوف کی تلاش کے باوجود لوگ مطمئن نہیں ہو پا رہے ہیں۔ ایسے معا...

میں جہاں فردِ اور فرد کے درمیان، فرد اور کائنات کے درمیان کسی رشتے یا تعلق کا وجود باقی نہ رہا ہو۔ جہاں اپنی ذات کے دائرے سے باہر ہر چیز کی معنویت موہوم اور معدوم ہو جائے وہاں ایک فنکار کے لئے صرف ایک رستہ کھلا رہتا ہے۔ زندگی میں کسی ایسے تصور کی تلاش کا جو رابطہ باہم کا کام سرانجام دے سکے۔ اِن اقدار کی دریافت یا باز یافت کا راستہ جس کی بنیاد پر آدمی ایک دوسرے کے انسانی تجربوں میں شریک ہو سکیں۔

ادب میں شعور سے لاشعور کی طرف ہجرت، اندرونی خود کلامی کا استعمال اُساطیر اور دیو مالاؤں کی داستانوں کی تجدید، ذات کے دائروں میں پناہ گزیں ہو کر اپنے حواس اور اعصاب کو فکر کا محور اور معیار بنانا ــــ یہ سب باتیں اس حقیقت کا اظہار ہیں کہ فنکار بیرونی دنیا کی جھوٹ، منافقت اور ریا کاری میں حسن خیر اور صداقت کی تلاش سے مایوس ہو کر ہمت نہیں ہار گیا ہے۔ بلکہ اس نے اپنی تلاش کا رُخ اب اپنی روح اور وجود کی گہرائیوں کی طرف موڑ دیا ہے۔ اس صورتِ حال میں ایک ادیب اور شاعر کا اپنے وجود کے دائرے میں مقید ہو جانا نہ غیر فطری ہے اور نہ غیر نفسیاتی یہ کیفیت اُسے احتسابِ نفس INTROSPECTION کی عادت دیتی ہے حیات و کائنات سے اپنے تعلق کو سمجھنے اور نئے رشتے استوار کرنے کے لئے ایک نئی معنویت کی تلاش بن جاتی ہے۔

یورپ میں یہ عمل برسوں سے ہو رہا ہے۔ بودلیئر جوائس اور کافکا اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ ہمارے ہاں بھی یہ کام شاعروں اور ادیبوں کا ایک مختصر طبقہ اپنے حدود میں سرانجام دے رہا ہے۔ اس سلسلہ میں شاعروں میں اختر الایمان۔ یوسف ظفر۔ مجید امجد۔ مختار صدیقی اور افسانہ نگاروں، ناول نولیسوں میں عزیز احمد۔ قرۃ العین حیدر اور حسن عسکری وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں.... اس نقطۂ نظر سے زیرِ نظر شمارہ کی مختلف چیزوں میں ایک

معنوی ہم آہنگی موجود ہے۔

قرۃ العین حیدر کے ناول میں سرکھیا کہتی ہے۔ "میری اور تمہاری کوئی چیز مشترک نہیں۔ نہ یہ بگ نہ کاغذات، نہ یہ مکان۔ چیزیں حتیٰ کہ یادیں کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں جس میں تمہارے ساتھ حصہ لگا سکوں۔ صرف دکھ مشترک ہیں۔ لیکن تم اپنے دکھ کو بھی اپنے لئے محفوظ رکھنا چاہتے ہو۔"

جوائس کا کردار ڈیفی کہتا ہے "روح کی تنہائی سے مفر ناممکن ہے۔ ہمارا وجود ہمارا اپنا ذاتی معاملہ ہے تم اسے کسی اور کے حوالے نہیں کرسکتے۔"

سید قاسم محمود کے افسانے کا راوی کہتا ہے "آج سے دس کھرب سال پہلے زندگی تری سے نکل کر خشکی پر آئی تھی۔ لیکن آج تو زندگی جب دس کھرب سال بعد دوبارہ ساحل پر آئی تو وہ مردہ تھی۔"

حصۂ نظم میں "بہ سطحِ آبِ رواں اک کرن کہ میری حیات" سے لے کر "اُگ جوٹ ایک خلش، ذوق تجسس کا مآل" تک ایک ہی تلاش اور ایک ہی تڑپ کی نمود روپ بدل بدل کر نظر آئے گی۔

★

"سوغات" کا یہ شمارہ ایک ماہ کی تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔ ادبی پرچوں کے لئے اب یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں رہی ہے۔ دوماہی اور سہ ماہی پرچے آٹھ آٹھ مہینوں میں ایک بار شائع ہوتے ہیں۔ لیکن یہ کوئی جواز نہیں ہو سکتا سوغات کے نکلنے میں جو تاخیر ہوئی اس کا مجھے بیحد افسوس ہے۔ اس سے بھی زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ اس تاخیر کی ساری ذمہ داری لکھنے والوں پر عاید ہوتی ہے اور یہ حضرات بدقسمتی سے میری دسترس سے اتنی دور ہیں کہ سوائے ہر مرتبہ جھلا کر خطوط لکھنے کے میں اور کچھ نہیں کرسکتا۔ تاہم پوری کوشش کی جائے گی کہ آئندہ سے سوغات ٹھیک وقت پر شائع ہوسکے۔

بنگلور مئی ۵۹ء

محمود ایاز

ایرش فرام

زوالِ آدمِ خاکی!!

نشاۃ ثانیہ کے آغاز نے مغربی انسان کے سامنے اُس کے عروج و تکمیل کے دروازے کھول دئے تھے اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اب انسان بڑی تیزی سے اپنے تمام خوابوں اور آدرشوں کی تکمیل کی طرف گامزن ہو گیا ہے اُس نے استبدادی کلیسا کے اقتدار سے فرسودہ روایات کی زنجیروں سے اور ایک نیم دریافت شدہ دنیا کی جغرافیائی حدود سے آزادی حاصل کر لی تھی۔ اِس نے ایسے نئے علوم کی بنیاد ڈالی۔ جن کا فروغ پیداواری قوتوں میں عدیم المثال اضافہ کا باعث بنا۔ اور اِس اضافہ نے ساری مادی دنیا کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ اِس نے ایسے سیاسی نظاموں کی تشکیل کی جو فرد کی آزاد نشوونما کے ضامن سمجھے گئے۔ مشین اور سائنس کی مدد سے اُس نے کام کے گھنٹوں کو مختصر بنا کر فرصت کے اوقات میں اتنا اضافہ کر دیا کہ اُس کے آبا و اجداد اِس کا تصور تک نہ کر سکتے تھے۔

لیکن آج ہم کہاں تک پہنچ سکے ہیں؟ ایک عالمگیر تباہی لانے والی جنگ کا خطرہ ہر وقت ساری انسانیت کے سر پر منڈلا رہا ہے۔ یہ خطرہ قیامِ امن کی تمام کوششوں کے باوجود بدستور برقرار ہے لیکن اگر نوعِ انسانی کے سیاسی نمائندوں میں ابھی اتنی سمجھ بوجھ باقی ہے کہ وہ اس جنگ کو ٹال سکیں تب بھی جدید انسان اپنے اِن خوابوں اور آدرشوں کی تکمیل کی منزل سے کوسوں دور ہے جو اُس نے سولھویں، سترھویں۔ اور اٹھارویں صدی میں اتنی آرزوؤں سے دیکھے تھے انسان نے اپنے ہاتھوں سے جس دُنیا کی تعمیر کی تھی آج اُسی دُنیا کے تقاضے خود اُس کے کردار کی تعمیر کر رہے ہیں۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی تک انسان کے کردار میں ذخیرہ اندوزی اور

منافع بازی کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ دوسروں کے استحصال اور اپنی آمدنی کو بچا کر اس سے مزید منافع حاصل کرنے کی خواہشات زندگی میں اُس کے سارے اعمال و افعال کا تعین کرتی تھیں لیکن آج بیسویں صدی کا انسان ذخیرہ اندوزی اور منافع بازی کی بجائے زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے اور استعمال کرنے کی طرف مائل ہے۔ اُس کی فرصت کے بیشتر اوقات میں اُس کی حیثیت ایک ایسے محول کی ہوتی ہے جو بیرونی اثرات کو بغیر کسی مزاحمت کے قبول کرنے کے لئے آمادہ رہتا ہے۔ کھانے، پینے اور سگریٹ سے لے کر کتابیں، لیکچر، مناظر اور فلم تک ہر چیز اُس کی غذا بن گئی ہے۔ ساری کائنات اُس کی بھوک فرو کرنے کا ذریعہ بن گئی ہے۔ گویا کائنات نہ ہوئی ایک بڑا خوش رنگ سیب، ایک بڑی شراب کی بوتل ہو گئی۔ اس کائنات کو آدمی نے پستان سمجھ کر اُس پر اپنے دانت گاڑ رکھے ہیں۔ اس طرح آدمی ازلی طلب گار اور ازلی نامراد بن گیا ہے۔

ذاتی اور انفرادی طور پر انسان اگر خریدار کی حیثیت اختیار کر گیا ہے تو اجتماعی طور پر معاشرے کے ایک فعال کارکن کی حیثیت سے اُس کا رول کاروباری کا ہو گیا ہے۔ ہمارے سارے معاشی نظام میں بازار MARKET کی حیثیت مرکزی ہے۔ کیونکہ اشیا کی قیمتوں کا تعین اور سماجی پیداوار میں ہر ایک کے حق اور حصے کی تقسیم بازار ہی سے ہوتی ہے اب انسان کی معاشی کارروائیوں پر تاریخ کے گذشتہ ادوار کی طرح طاقت، روایت یا دھوکہ بازی اور مکاری کا تسلط نہیں رہا۔ اُسے پیداوار کی اور پیداوار کو فروخت کرنے کی مکمل آزادی حاصل ہے بازار اُس کے لئے میدانِ حشر سے کم نہیں کیونکہ یہیں اُس کی کوششوں کی کامیابی اور ناکامیابی کا فیصلہ ہوتا ہے اس بازار میں صرف اشیاء کی فروخت اور ان کی قیمتیں نہیں لگائی جاتیں۔ بلکہ خود محنت بھی یہاں ایک بکاؤ مال بن گئی ہے! اور محنت بازار میں جائز مسابقت کے اصولوں کے تحت بیچی جاتی ہے۔ لیکن بازار اشیا کی فروخت کا یہ نظام، محنت اور اشیائے کے معاشی دائرے سے کہیں آگے بڑھ چکا ہے انسان نے خود اپنے آپ کو ایک قابلِ فروخت شئے میں تبدیل کر لیا ہے اپنی زندگی اُس کے لئے فائدہ بخش طور پر کاروبار میں لگائے جانے والا سرمایہ بن گئی ہے۔ اس کاروبار میں اگر اُسے منافع ہوا تو وہ ایک کامیاب انسان ہے ورنہ بصورت دیگر ناکامیاب۔ اُس کی قدر و قیمت کا تعین اُس کی جمالیاتی صلاحیتوں یا عقل اور محبت جیسے انسانی خصائص سے

نہیں ہوتا بلکہ بازار میں اُس کا جو مول اُٹھتا ہے وہی اس کی قیمت ہوتی ہے اس وجہ سے
وہ خود اپنی نظروں میں اپنی قدر و قیمت کے تعین کے لئے اپنی کامیابی اور دوسروں کے فیصلوں
کا محتاج ہوتا ہے چونکہ اُسے ان دوسرے لوگوں کا محتاج رہنا ہے اس لئے اُس کی سلامتی اسی میں
ہے کہ وہ رسم و رہِ عام سے ایک قدم آگے نہ بڑھنے پائے اور اپنے آپ کو بھیڑ چال کے
سپرد کر دے۔

انسان کے اس اجتماعی کردار کو متعین کرنے میں بازار کے ساتھ صنعتی پیداوار کا مروجہ نظام
بھی ایک اہم رول ادا کرتا ہے۔ پیداواری منصوبے بڑھتے اور وسیع ہونے لگتے ہیں تو ان کے ساتھ
مزدوروں اور کلرکوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ کارخانوں کی ملکیت کا انتظامی امور
سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کارخانوں کے بڑے بڑے مالک ایک پیشہ ور دفتری طبقہ کے تابع
ہوتے ہیں جن کا واحد مطمحِ نظر یہ ہوتا ہے کہ کام بغیر کسی خلل کے چلتا رہے اور کاروبار میں توسیع
ہوتی رہے۔ منافع بذاتہٖ ان کا مقصد نہیں ہوتا۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کام کی رفتار کو
ہموار اور اطمینان کے ساتھ جاری رکھنے کے لئے ہمارے سماج کو کس قسم کے افراد کی ضرورت ہے؟
یقیناً ایسے افراد کی جو وسیع اجتماعی حلقوں میں ہم آہنگی کے ساتھ کام کر سکیں۔ جو زیادہ سے
زیادہ چیزوں کو اپنی ضروریاتِ زندگی میں شامل کرنا چاہتے ہوں۔ جن کے مذاق اور پسند کو ایک
بندھے ٹکے عام معیار پر قائم کرنے کے لئے باآسانی سمجھا اور متاثر کیا جا سکے جو اپنے آپ کو
آزاد۔ خود مختار اور کسی اصول، طاقت یا ضمیر کے پابند نہ تصور کرتے ہوں۔ مگر بہ رضا و رغبت
اپنے افعال اور اعمال کو مشروط اور پابند بنانے پر آمادہ ہو جائیں۔ اور سماجی مشین کے پرزے
بن کر اپنی اپنی جگہ کام کرتے رہیں۔ جنہیں کسی جبر کے بغیر حسبِ دل خواہ راستوں پر چلایا جا سکے
رہنماؤں کے بغیر جن کی رہبری کی جا سکے۔ جو کسی مقصد یا سمت کے بغیر صرف آگے بڑھنے اور
چلتے رہنے کی خاطر بڑھتے اور چلتے رہ سکیں۔

جدید سرمایہ داری اس قسم کا آدمی پیدا کرنے میں کامیاب ہو چکی ہے۔ مشینی آدمی۔ اپنی
ذات اور اپنے شخصی وجود سے محروم انسان۔ یہ انسان اپنی ذات اور شخصی وجود سے محروم ہے
کیونکہ اُس کے افعال اور اُس کی قوتیں اُس کی اپنی نہیں رہی ہیں۔ یہ افعال اور قوتیں اُس کے

اُس کے تابع نہیں رہیں۔ بلکہ یہ اُن کے تابع ہوگیا ہے۔ اُس کی قوتِ حیات، اشیاء اور اداروں میں منتقل ہوگئی ہے۔ اور یہ اشیاء اور ادارے ایسے قابلِ پرستش بُت بن گئے ہیں جنہیں وہ اپنا حاکم اور معبود سمجھتا ہے اپنی ذات سے بچھڑا ہوا انسان اپنی خود ساختہ قوتوں کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتا ہے اُس کے بُت زندگی کی اُن قوتوں کے نمائندہ بن جاتے ہیں۔ جو اب اُس کی ذات سے الگ ہو چکی ہیں۔ اس کے بعد انسان اپنی ارادہ و اختیار کی قوت اور اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کا شعور کھو کر ایک کمزور اور تہی مایہ "چیز" بن کر اپنی ذات سے باہر اُن دوسری چیزوں کا محتاج ہو جاتا ہے۔ جن میں اس نے اپنی زندگی کا جوہر تحلیل کر دیا ہے۔

انسان نے اپنے سماجی جذبات کو ریاست میں منتقل کر دیا جو نیز ریاست اُس کے سماجی جذبات کا مظہر بن گئی۔ اس لئے وہ ریاست اور ریاست کے نمائندوں کی پرستش کرتا ہے اپنی دانشمندی، ہمت اور احساسِ اقتدار کو اپنے لیڈروں کی شخصیتوں میں مجسم کر کے ان لیڈروں کو اپنا بُت بنا کر پوجتا ہے۔ ایک مزدور، کلرک، یا منیجر کی حیثیت سے جدید انسان کا اپنے کام سے شعوری ربط اور تعلق باقی نہیں رہا ہے۔ کارخانوں میں مزدور کی حیثیت ایک معاشی ذرّے سے زیادہ نہیں جو ایک خود کار تنظیم کے اشاروں پر رقص کرتا ہے اپنے کام کی نوعیت اور اس کے نتائج سے اُس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ جن اشیاء کی پیداوار میں مصروف کار ہوتا ہے۔ وہ اشیاء اپنی مکمل شکل میں ہمیشہ اُس سے دور رہتی ہیں۔ دوسری طرف کاروبار کے منتظم یا منیجر کے سامنے تیار شدہ مال تو ہوتا ہے۔ لیکن اس مال کی افادیت اور حقیقت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اُس کا کام تو بس اتنا ہے کہ وہ دوسروں کے لگائے ہوئے سرمائے کو منافع بخش طور پر استعمال کرے لہٰذا اُس کے نزدیک پیداوار کا اپنا کوئی مصرف نہیں ہوتا اور پیداوار اُس کے لئے سرمایہ کی ایک منقلب شدہ شکل سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ اُس کا کام اشیاء اور اعداد سے آگے نہیں بڑھتا آدمی اُس کے لئے کام کرنے والی مشینوں کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان آدمیوں کے استعمال میں بظاہر انسانی تعلقات کا ذکر بڑے زور و شور سے کیا جاتا ہے۔ لیکن دراصل یہ تعلقات انتہائی غیر انسانی بن گئے ہیں۔ کیونکہ کٹھ پتلیوں کے درمیان انسانی تعلقات بے معنی ہیں .... ہم لوگ اپنی ضروریات کی خریداری میں بھی اپنی شخصیت

سے بے گانہ ہو گئے ہیں۔ اپنے مذاق اپنی آنکھوں اور اپنے کانوں کی بجائے اشتہاری فقروں کے خوشنما جملے چیزوں کو خریدنے میں ہمارے مددگار ہوتے ہیں۔ ایک شہری کی حیثیت میں جدید آدمی دوسرے آدمی کے لئے اپنی جان تک دینے کو تیار ہو جاتا ہے لیکن اپنی ذاتی اور انفرادی زندگی میں یہی آدمی انتہائی خودغرض اور انانیت پسند ثابت ہوتا ہے۔ چونکہ ہر پیشہ زندگی سے کٹ چکا ہے لہٰذا آدمی کے لئے اپنے کام میں کوئی معنویت باقی نہیں رہتی اور نتیجۃً آدمی مکمل بے کاری اور فرصت کا متمنی ہو جاتا ہے اُسے اپنے کام اور ہنر سے نفرت ہو جاتی ہے کیونکہ کام کے دوران میں وہ اپنے آپ کو محبوس اور ریاکار محسوس کرنے لگتا ہے۔ فرصت اور بے کاری اُس کے بلند ترین آدرش بن جاتے ہیں! ایسی بے کاری جس میں اپنی جگہ سے ہلنے تک کی ضرورت نہ پڑے کوڈک کے مشہور اشتہاری جملہ "آپ بٹن دبائیے باقی کام ہمارے ذمہ" کی طرح ہر کام خود بخود ہو جائے۔ بیکاری، تساہل اور آرام طلبی کے اس رجحان کو موجودہ اقتصادی نظام اور زیادہ تقویت دے رہا ہے یہ میلان بالآخر جس صورت حال پر منتج ہوگا۔ اُس کا ایک بہت اچھا خاکہ آلڈس ہکسلے کے ناول THE BRAVE NEW WORLD میں ملتا ہے۔ ہم میں سے اکثر کی ذہنی ساخت اور تعمیر کو بچپن ہی سے جس طرح مشروط کیا جاتا ہے اُس کی پوری تفصیل ان چند جملوں میں آ جاتی ہے۔

"جو لطف آج حاصل کر سکتے ہو اُسے کل پر مت ٹالو۔" اگر میں اپنی خواہشات کی تکمیل کو ملتوی نہ کروں (میری افتاد ہی ایسی پڑی ہے کہ میں وہی خواہشیں کرتا ہوں جو پوری ہو سکتی ہیں) تو پھر میری شخصیت میں تضادات، کشمکش اور شکوک نہیں پیدا ہونے پائیں گے۔ کوئی فیصلہ کرنے کی زحمت نہیں پڑے گی۔ میں کبھی اپنے ساتھ تنہا نہیں رہتا۔ کیونکہ میرا سارا وقت مصروفیت میں گذرتا ہے یا تو میں کام میں مصروف رہتا ہوں یا پھر تفریح میں مشغول۔ مجھے اپنے آپ سے متعارف ہونے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ مجھے اپنی مشغولیات سے اتنی فرصت ابھی نہیں ملتی میں اپنی ذات میں خواہشات اور اُن کی تکمیل کا ایک نظام ہوں۔ مجھے کام اس لئے کرنا پڑتا ہے کہ میں اپنی خواہشات کو پورا کر سکوں"
اور یہ خواہشات موجودہ معاشی نظام کے ہاتھوں نو بہ نو صورت میں پیدا اور متعین ہوتی رہتی ہیں ہم خدا سے اور اپنے ہمسایہ سے محبت کی مسیحی روایات کی تقلید کے مدعی ہیں عام طور

پر یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ ہم اس وقت مذہب کی تجدید اور احیاء کے ایک نہایت اُمید افزا دور سے گزر رہے ہیں۔ لیکن حقیقت میں یہ باتیں سچائی سے کوسوں دور ہیں۔ مذہب کی اصلی تعلیمات اور مظاہر کو ہم نے ایسے فارمولوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ جو اپنی ذات سے بچھڑے ہوئے انسان کی مقاصد برآری میں معاون ثابت ہو سکیں۔ کامیاب دنیاداری کی خاطر اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لئے "اپنی مدد آپ کرو" کی بنیاد پر مذہب کو استعمال کیا جا رہا ہے۔ خدا کاروبار میں حصہ دار بن گیا ہے۔ "تعمیری اور ایجابی فکر" کے دوسرے معنی ہیں "دوست بنانا اور لوگوں کو متاثر کرنا" (HOW TO WIN FRIENDS & INFLUENCE PEOPLE)

محبت ایک نادر الوقوع عجوبہ بن گئی ہے۔ کٹھ پتلیاں محبت نہیں کرتیں۔ اپنی ذات سے محروم آدمی محبت سے بے نیاز ہوتا ہے۔ شادی اور محبت کے مثالی معیار ماہرین کے نزدیک یہ ہیں کہ دو فرد خوش اسلوبی کے ساتھ ایک دوسرے سے نبٹ سکیں۔ اور انکی باہمی محبت زندگی کی ناقابلِ برداشت تنہائی اور خود پرستی سے فرار کی جائے پناہ بن سکے۔

اِن حالات میں مستقبل سے کیا توقعات قائم کی جا سکتی ہیں؟ اگر خوش فہمیوں سے قطعِ نظر کر کے سوچا جائے تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ عقلِ سلیم اور میکانکی ذہانت کے درمیان بڑھتا ہوا بُعد لامحالہ دنیا کو ایٹمی جنگ کے دوزخ میں جھونک دے گا۔ اس جنگ کا ناگزیر نتیجہ یہ ہوگا کہ صنعتی تہذیب مکمل طور پر فنا ہو جائیگی۔ اور انسان دوبارہ ابتدائی تاریخ کے زراعتی دور میں پہونچ جائے گا۔ لیکن اگر یہ تباہی اتنی مکمل نہ بھی ہوئی جیسا کہ چند ایک ماہرین کا خیال ہے تو یہ ضرور ہوگا کہ جو بھی فریق اس جنگ میں فتحیاب ہے گا وہ ساری دنیا کو از سر نو منظم کر کے اپنے زیرنگیں کرے گا۔ اس صورت میں ایک ایسی قادرِ مطلق اور مرکزی ریاست کی ضرورت ناگزیر ہو جائیگی۔ جس کی بنیاد جبر اور احتساب پہ قائم ہو۔ یہ ریاست خواہ واشنگٹن میں قائم ہو یا ماسکو میں اصل صورتِ حال بعینہٖ برقرار رہے گی۔

لیکن بدقسمتی تو یہ ہے کہ جنگ کے بغیر بھی حالات کسی خوش آئند مستقبل کی بشارت نہیں دیتے۔ حالات کی رفتار اور سمت دیکھتے ہوئے یہ پتہ لگانا مشکل نہیں کہ آئندہ سو پچاس برس میں سرمایہ داری اور کمیونزم دونوں کا ارتقا انسان کو مکمل طور پر میکانی اور اپنی ذات اور وجود

سے بیگانہ بنا دے گا۔ یہ دونوں نظام جس قسم کے کلچر کی معاشرے کو پیدا کر رہے ہیں ان میں ایسے
خوش خوراک، خوش پوشاک، مطمئن قسم کے لوگ ہونگے جن کے لئے ایسی آرزوں اور تمناؤں کا سوال
ہی باقی نہ رہے گا جو دشوار یا ناممکن الحصول ہوں۔ یہ ایسی کٹھ پتلیاں ہونگی جنہیں بغیر کسی جبر کے بغیر
کسی ہنمائی کے کام میں لایا جاسکے گا یہ معاشرے ایسی مشینیں پیدا کریں گے۔ جو آدمیوں کی طرح کام
کرینگی اور ان معاشروں میں ایسے انسان پیدا ہوں گے، جو مشینوں کی طرح ہونگے۔ اس معاشرے کے
افراد کے پاس ہوشیاری اور ذہانت ہوگی۔ لیکن عقل سلیم اور سمجھ بوجھ کی صلاحیت نہ ہوگی۔ اور
اس طرح انسان بے پناہ مادی طاقتوں سے لیس لیکن ان طاقتوں کے صحیح استعمال سے ناواقف
رہ کر ایک خطرناک صورت حال پیدا کر دیگا۔

بڑھتی ہوئی پیداوار اور زیادہ سے زیادہ آرام و آسائش کے وسائل مہیا کر لینے کے باوجود
آج کا انسان یہ محسوس کرنے لگا ہے کہ اس کی زندگی بے معنی ہو گئی ہے۔ وہ اپنی ذات کے عرفان سے
محروم ہے۔ یہ اور بات کہ یہ احساس بڑی حد تک غیر شعوری ہے! انیسویں صدی میں "خدا کی موت" کا مسئلہ
درد سر بنا ہوا تھا۔ لیکن بیسویں صدی میں "انسان کی موت" موضوع بحث بن گئی ہے۔ انیسویں صدی میں
بہیمیت کے معنی تھے۔ ظلم و ستم اور سفاکی۔ بیسویں صدی میں اس کے معنی ہیں اپنی ذات سے محرومی۔ ماضی میں
یہ خطرہ تھا کہ کہیں انسان غلام نہ بن جائے آج خطرہ یہ ہے کہ آدمی کہیں "رابٹ" ROBOT
نہ بن جائے یہ سچ ہے کہ مشینیں بغاوت نہیں کرتیں مگر مشینوں کو انسان کی فطرت مل جائے تو وہ زندہ اور
صاحب ہوش رہ سکتی ہیں۔ لیکن آخر ایک بے مصرف اور بے معنی زندگی کی اکتاہٹ سے تنگ آ کر وہ
اپنے ساتھ ساری کائنات کو فنا کر دیتی ہیں۔

آخر اس صورت حال سے نجات کا ذریعہ کیا ہے، اس کا جواب ایمرسن کے الفاظ میں تھوڑے بہت
تصرف کیساتھ دیا جاسکتا ہے۔ ایمرسن نے کہا تھا کہ "اشیاء آدمی پر زین کس کے سواری کر رہی ہیں اب
صورت حال کو پلٹ کر انسان کو اشیاء پر زین کسنے کا موقعہ دیا جائے۔" گویا دوسرے الفاظ میں اس کا
مطلب ہوا کہ انسان اپنی ذات کی بازیافت کرے اور ان بتوں کی پرستش سے باز آجائے جنہوں نے
اسے مجہول اور ناکارہ بنا کر رکھدیا ہے۔ اگر نفسیات کے دائرے میں رہکر سوچا جائے تو اس بازیافت
کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنی موجودہ کاروباری اور مجہول حیثیت کو بدلنے۔ معمول بنائے رہنے کی

بجائے اپنی ارادہ اختیار کی قوتوں کو بیدار کرنے۔ دوبارہ اپنی ذات سے آگہی حاصل کرے چاہے اور چاہے جانے کی صلاحیتوں کو زندہ کرے اپنے کام کو ایک بامعنی اور بامصرف عمل کی شکل دے مادی اغراض سے بلند ہو کر محبت، سچائی، انصاف اور روحانی اقدار کو اپنا واحد مطمح نظر قرار دے لیکن زندگی کے روحانی اور مادی دونوں پہلوؤں کو اگر مد نظر نہ رکھا جائے تو صرف ایک طرفہ ذہنیت پیدا ہو سکتی ہے۔ انسانی زندگی کے کسی ایک شعبہ کی ترقی میں دوسرے شعبوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو ایک شعبہ کی ترقی دوسرے شعبوں کی تخریب کا باعث بن جاتی ہے۔ تاریخ میں اس کی مثالیں عام ہیں روحانی نجات کو واحد مقصد قرار دینے کا نتیجہ رومن کیتھولک چرچ کی صورت میں نمودار ہوا۔ انقلاب فرانس نے سیاسی اصلاحات کو خدا بنا لیا۔ تو اس کا انجام روبسپیئر اور نپولین پر ہوا۔ سوشلزم نے فقط معاشی انقلاب سے سروکار رکھا تھا تو وہ اسٹالنزم کی شکل اختیار کر گئی۔

انسانی زندگی میں ہر جہتی تبدیلی پیدا کرنے سے پہلے ہمیں ان سیاسی اور معاشی تبدیلیوں کے بارے میں غور کرنا پڑے گا۔ جن کے بغیر انسان کی اپنی ذات سے علیحدگی کی نفسیاتی وجوہات پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔ صنعتی طریقہ کار کو تو برقرار رکھنا ہوگا لیکن صنعتوں کی مرکزیت کو اس حد تک ختم ہو گا۔ جہاں پر ان کی نوعیت "مشینی" کی بجائے "انسانی" بن سکے۔ صنعتوں کو اجتماعی اور مرکزی بنا کی اتنی ہی آزادی دی جانی چاہیے جتنی کہ ناگزیر ہے۔ معاشی دائرہ میں اُن سب لوگوں کو منتظم میں مشترکہ حصہ دار بننا چاہیے۔ جو پیداوار میں حصہ لیتے ہیں، تاکہ اس طرح ان کی محنت ایک ذمہ دارانہ شعوری اور اختیاری عمل بن سکے۔ اس قسم کی حصہ داری کی مختلف صورتیں پیدا کی جا سکتی ہیں۔

ثقافتی احیا کے پروگرام میں نوعمروں کی تعلیم اور تعلیم بالغان کے ساتھ فنون لطیفہ کے درس اور غیر مذہبی SECULAR قسم کی عبادات کو قوم میں رائج کرنا ہو گا۔ جس طرح قدیم آدمی فطرت کی قوتوں کے آگے بے بسی محسوس کرتا تھا اسی طرح موجودہ دور کا انسان اپنی خود ساختہ سماجی اور معاشی قوتوں کے سامنے بے بس ہو گیا ہے۔ وہ خود اپنے بنائے ہوئے بتوں کے آگے سجدے کرتا ہے اس کے ہونٹوں پر خدا کا نام آتا ہے۔ حالانکہ خدا نے اسے بت شکنی کا حکم دیا تھا۔ انسان کی دیوانگی نے جو حالات پیدا کر دئیے ہیں۔ اُن کے خطرناک نتائج سے بچنے کی واحد صورت یہی ہے کہ وہ ایک ایسے متوازن اور صالح معاشرہ کی تخلیق کرے جو انسان کی

یات اس کی ذات اور وجود کے بنیادی تقاضوں سے ہم آہنگ ہو۔ ایک ایسا معاشرہ جس
نسان ایک دوسرے کے ساتھ اخوت کا مظاہرہ کرسکیں۔ جہاں افراد نسل اور زمین کی بجائے
ی محبت کے رشتے میں بندھے ہوئے ہوں۔ ایک ایسا معاشرہ جس میں انسان کو تخریب کی بجائے
ق کے ذریعہ فطرت پر فتح پانے کے راستے مل سکیں۔ جہاں انسان بندھے ٹکے اصولوں کی پابندی
جائے اپنے ارادہ و اختیار کی قوتوں کو بروئے کار لاکر خود آگاہ بن سکے۔

ایسے معاشرہ کی تشکیل دراصل صرف ابتدا ہوگی۔ یہاں انسان کے غیر انسانی دور کا خاتمہ
کا ایسا دور جس میں انسان مکمل طور پر انسان نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے
راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔ اس کے برعکس انسان کیلئے یہ متعین ہو چکا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں
م پر ایسے مسائل سے جہد آزما رہے جو حل ہو کر بھی حل نہیں ہوتے۔ جس وقت انسان انسانی
ی کو۔ خواہ وہ عہد جہالت کی طرح دیوتاؤں کو بھینٹ کی صورت میں ہو یا جنگ کی صورت
ترک کر چکے گا۔ جب فطرت سے اس کا رشتہ اندھے عقیدہ کی بجائے عقل پر قائم ہوگا۔
شیا اس کے معبود بنے رہنے کی بجائے اُس کی محکوم ہو جائیں گی۔ تب کہیں جا کر انسان کی
کشمکشوں اور مسائل کی ابتدا ہوگی۔ ایسے مہم جو، تجسس اور تخیل کی دولت سے مالا مال ہونا ہوگا
اور نشاط سے لطف اُٹھانے کی صلاحیت پیدا کرنی ہوگی لیکن اس کی تمام قوتیں اور صلاحیتیں
گی کے لئے ہونگی۔ موت اور تخریب کے لئے نہیں۔

انسانی تاریخ کا یہ نیا دور اگر کبھی شروع ہوا تو وہ انسانیت کے آغاز کا ہوگا۔ خاتمہ
یں۔

محمد حسن

نئے ادبی تقاضے

آج اُردو ادب کی رفتار کے بارے میں عام طور پر دو رویّے اختیار کیے جاتے
طرف وہ لوگ ہیں جو اُردو ادب میں جمود بلکہ اس کی موت کا اعلان کر چکے ہیں۔ دوسری طرف
ہیں جو ادب میں جمود یا سُست رفتاری کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک ادب کے میدان
خیریت ہے۔ مضامین لکھے جا رہے ہیں افسانے چھپ رہے ہیں۔ تحقیقی اور تخلیقی ادب
اس سے زیادہ کبھی بھی تیز تر نہیں ہوئی تھیں۔

مجھے شروع ہی میں یہ اعتراف کرنے کی اجازت دیجیے کہ میں ان دونوں حضرات سے ا
ہوں۔ اُردو ادب میں جمود کا نوحہ زیادہ سے زیادہ منفی ہے۔ اگر کوئی ادیب یا ادیبوں کا
ادب کی رفتار سے مطمئن نہیں ہے تو اس کا کام جمود یا موت کے الفاظ کہہ دینے ہی سے
یہ تو محض تشخیصِ مرض ہوئی اس سے آگے بڑھ کر حل پیش کرنے کا سوال ہے سنجیدہ اور
کا تقاضہ یہی ہے کہ نہ صرف ناآسودگی کا اظہار کیا جائے بلکہ اس کو دور کرنے کے ذرائع ا
تجویز کیے جائیں۔ جو لوگ آج جمود سے بے اطمینانی کا اظہار کر رہے ہیں۔ وہ کل تک ادب کی
متعین ہونے کی بنا پر اس پر معترض تھے۔ پھر یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ ادب میں جمود
ہی ادب میں کئی نئے میلان آئے ہیں کہانیوں میں ہماری معاشرت کا زیادہ گہرا اور سچا نقشہ
ہے۔ غزل کی تجدید ہوئی ہے۔ ہنگامی موضوعات سے توجہ ہٹ کر فکر کے دوسرے پہلوؤں
مبذول ہوئی ہے۔ تحقیق کی طرف توجہ کی گئی ہے۔ ان میلانات سے ہمیں اتفاق ہو یا اخ
ان کے وجود کا انکار ممکن نہیں ہے۔ اور اگر حقیقتاً ادب کسی سمت میں حرکت کر رہا ہے
کہنا بے انصافی کی بات ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اس سمت کو کوئی غلط قرار دے ا
کرنے کی کوشش کرے۔ ...... اس بحث کا دوسرا پہلو یعنی ادب میں سب خیریت

ے اس سے اتفاق کرنا بھی آسان نہیں۔ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ادیبوں کا ایک
خاصہ طبقہ سنجیدہ اور ذمہ دار فکر سے فرار اختیار کر رہا ہے اور روز بروز داخلیت
ی میں محصور ہوتا جارہا ہے۔ اینٹی نرگسیت" کا بھی جواز ہے مگر اس لئے اسباب ہیں قطع
یت" کو صحت مند ادبی رجحان قرار دینا دشوار ہے غزل کا احیا۔ آزاد نظم سے خصوصاً
کاری سے عام طور پر توجہ ہٹ جانا افسانوں میں داخلیت کا گہرا رنگ غزل میں میرے
دہ بھی میر کے کائناتی احساس کے بجائے ان کی غم پرستی اور شہزادہ گل فام کی طرح اپنی
ے کنویں میں اسیر ہو جانے کے انداز سے متاثر ہونے کا رجحان ــــ یہ سب ایسے میلانات
سنجیدگی سے غور کرنا چاہئیے۔

نسل نے کم و بیش ایک بت شکن "عہد" میں آنکھ کھولی ہے۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر سنجیدہ غور
رہ اور سماجی افادیت کا جزو بنا لیا گیا تھا۔ نئی نسل نے اپنی آنکھوں کے سامنے اشالن کے
ش پاش ہوتے دیکھا۔ ترقی پسند ادب کے لب لہجہ سے بے اطمینانی پائی۔ خود اشتراکی عقید
ے مدوجزر آئے اور اس طرح نئی نسل میں سے اکثر نے جس طرح اشتراکیت اور مارکسزم کو نجات کا واحد
تھا وہ عقیدہ متزلزل ہو گیا مگر اس کا انجام یہ نہیں ہوا کہ اشتراکیت پر ایک سماجی اور فکری نظام کی حیثیت سے غور
ور یا تو اس کے صحیح تصور کو رائج کیا جاتا یا اُسے مکمل طور پر رد کر کے ایک نئے نظامِ فکر کی داغ بیل ڈالی جاتی اس
نسل کے بعض لوگوں نے تشکیک کو ناگزیر سمجھ کر تسلیم کر لیا۔

س میں شک نہیں کہ تشکیک بھی سنجیدہ فکر کے راستے کھولتی ہے۔ عقیدے کے دروازے
ے اور اسی کے سہارے انسان نئی حقیقتوں تک رسائی حاصل کرتا ہے مگر تشکیک کبھی بلندیٔ فکر کی
ہوتی ہے اور کبھی عجزِ فکر کی۔ تشکیک اگر صحت مند نہ ہو تو فکر کے دروازے بند کر دیتی ہے
انی ذہن لیڈی آف شیلاٹ کی طرح رہ گذر سے منہ پھیر کر آئینے میں صرف پرچھائیاں
دیکھتا رہ جاتا ہے۔ ادیب محض تشکیک اور مردم بیزاری میں زندگی بسر نہیں کرتا یا از کم
ادیب کو ایسی زندگی بسر نہیں کرنا چاہئیے۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اُسے اپنے عہد کے
مقبول اور مقبول نظریوں میں سے کوئی نہ کوئی نظریہ، فلسفہ، یا عقیدہ ضرور اپنا لینا چاہئیے۔
طلب محض یہ ظاہر کرنا ہے کہ ادب فکر سے گریز کرنے والوں کی پناہ گاہ نہ ہونا چاہئیے فکر

کو مشعل دکھانے والوں کا ایوان ہونا چاہئے۔ ممکن ہے ادیب اپنے عہد میں چلن پانے والے سیا
عقیدوں اور نظریوں سے دامن بچانے پر مجبور ہو یعنی اس کے احساسات، جذبات اور ادراک ایسے
عقیدوں سے بدظن کرتے ہوں اور ان کی بنائی ہوئی صداقتوں کی تائید کے بجائے تردید کر
ہوں۔ ایسے دور میں ادیب اور شاعر حقیقت اور عصری صداقت کا اپنا تصور پیش کرے۔ ظاہر ہے
صداقت فلسفیانہ اور سائنٹفک صداقت سے پیرایہ اظہار اور پیرایہ فکر دونوں حیثیتوں سے مختلف
ہوگی۔ مگر یہ بھی ذمہ دارانہ اور سنجیدہ کاوش کا نتیجہ ہوگی۔ اور اسے بھی اپنے دور کے عقائد ا
نظریوں میں مناسب جگہ ملنی چاہئے۔

اس بیان سے ایک غلط فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ کچھ حضرات کو ممکن ہے یہ خی
ہوا ہو کہ میں ادیب کو فلسفی یا کم از کم ماہر عمرانیات کی وردی ضرور پہنا دینا چاہتا ہوں اور فن ک
سے وہ تقاضے کر رہا ہوں جو کبھی فلسفی سے اور اندنوں سائنس داں سے کئے جاتے ہیں۔ یع
وہ ہر سوال کا جواب دے۔ فلسفی اور مفکر زندگی کے بارے میں اپنے تصورات کو استدلال۔ ا
فلسفیانہ ربط دیتے ہیں اور انہیں ایک نظام فکر میں تبدیل کرتے ہیں۔ ادیب اور شاعر تجربات اور تخیل
پیچ در پیچ راستوں پر منڈلاتے ہیں۔ ان کے بیانات کو فلسفے کی کسوٹی پر پرکھنا صحیح نہیں۔ ان
فلسفیانہ استدلال۔ ربط و ترتیب اور تفکر کے منطقی انداز کا تقاضہ کرنا درست نہ ہوگا۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود کامیاب اور بڑے شاعر کا فرق یہی بتایا جاتا ہے کہ کا
شاعر کائنات کے مسائل سے آنکھ نہیں ملا سکتا وہ زندگی کی طرف کوئی منظم اور مرتب نق
نظر نہیں اپناتا۔ اس کی دنیا چھوٹی اور سطحی ہوتی ہے بڑے ادیب اور عظیم شاعر فنی بالیدگی ا
حسن کاری ہی پر قناعت نہیں کرتے وہ اس سے آگے بڑھ کر اپنے خیالات اور جذبات
ایک واضح سمت منعطف کرتے ہیں۔ جسے زندگی کے بارے میں ان کا بنیادی نقطہ نظر کہا جا سکتا
اس نقطۂ نظر کو عام طور پر مروجہ فلسفیانہ اور نظریاتی اصطلاحوں میں بیان کرنا دشوار ہوتا ہے
جیسے گوئٹے کو رومانی یا حقیقت پسند کہنا یا اقبال کو اسلامی اشتراکی، اشتراکی یا فاشسٹ کہنا
ان عظیم فن کاروں کی ایک ذہنی اور جذباتی سمت تھی۔ اس کا انکار کرنا ممکن نہیں اور یہی ذہنی اور جذ
آہنگ ہے جو ان کی شخصیت اور فن میں عظمت اور بالیدگی پیدا کرتا ہے۔

یہاں ایک اور مسئلہ کی وضاحت ضروری ہے۔ ادب میں نظریے کی کیا اہمیت ہے اور وہ کس حد تک فن کاری اور حسن کاری میں مددگار یا مخل ہوتا ہے۔ دراصل نظریے کا لفظ اردو میں تین چار مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ نظریہ کو IDEOLOGY کے معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے DOGMA کے معنوں میں بھی اور BELIEF کے معنوں میں بھی اردو تنقید کو جہاں اور بہت سے ضروری کام ابھی کرنے ہیں وہاں ایک بہت ضروری کام اصطلاحات کے صحیح معنوں کے تعین اور ان کے مفہوم کی حد بندی کا کام بھی ہے۔ اگر ایک اصطلاح بہ یک وقت مختلف معنوں میں استعمال ہوتی رہے گی تو اندازِ بیان میں ابہام اور غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان قائم رہے گا۔ اور یہ تنقید کا عجزِ بیان ہے۔

بہر حال نظریے سے یہ مراد لی جا سکتی ہے کہ شاعر اور فن کار کے لیے کسی نہ کسی مذہب یا سماجی نظام کو تسلیم کرنا ضروری ہے اس قسم کے عقیدے کی دو شکلیں ہو سکتی ہیں ایک کسی مذہب یا سماجی نظام کو پہلے تسلیم کر کے اسی کے اصول کے مطابق زندگی کے تجربات کو منظم کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً ایک مسلمان کے لئے شراب کے حرام ہونے کی دلیل اس کی سماجی مضرت سے زیادہ یہ ہے کہ اس کی حرمت نصِ قرآنی سے ثابت ہے یا سور کا گوشت کھانا اس لئے حرام ہے کہ اس کی مذمت اسلام نے کی ہے۔ گویا اس شکل میں عقیدت مند اپنے تجربات اور احساسات کو اپنے اعصاب، ذہن اور دل کو اپنی پوری شخصیت کو شروع ہی میں ایک تصور کے تابع کر دیتا ہے اور پھر ساری زندگی کو اسی عینک سے دیکھتا ہے اس کے لئے دوسرے نقطۂ نظر کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ یہاں انسانی ذہنی اور احساس پہلے جوابات پر ایمان لاتا ہے اور پھر سوالات قائم کرتا ہے اسی اندازِ فکر سے متکلمین اور SCHOLASTICISM کی ابتدا ہوتی ہے جن کا مقصد مذہب یا دین کی سچائیوں کو فلسفہ اور استدلال کے اصول پر پرکھنا نہیں ہوتا۔ بلکہ فلسفہ اور استدلال کے مطابق مذہبی صداقتوں کو ثابت کرنا ہوتا ہے۔ ایسے معتقدات کے بارے میں بھی دو رویے ہو سکتے ہیں۔ ایک روایتی اور دوسرا پُرخلوص شخصیت کے سارے سوز و گداز کے ساتھ۔ روایتی طور پر ان معتقدات کو تسلیم کرنے سے اعلیٰ ادب پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن ان معتقدات میں جب شخصیت کا سارا خلوص اور توانائی شامل ہو تو ان معتقدات سے بھی اعلیٰ ادب پیدا ہو سکتا ہے۔

پھر بھی معتقدات کو DOGMA یا کسی مروجہ فلسفے یا نظامِ اقدار کے معنوں میں استعمال
کر کے اُسے عظیم ادب کے لئے لازمی قرار دینا دشوار ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مذہب نے بھی اعلیٰ ادب پیدا
کیا ہے۔ ملٹن اور تلسی داس کو جنم دیا ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا ٹھیک نہ ہوگا کہ مذہب یا
اسی قسم کے کسی DOGMA کے بغیر اعلیٰ ادب پیدا نہیں ہوتا۔

اسی طرح اگر نظریے سے BELIEF مراد ہے تب بھی کم و بیش یہ سب باتیں کسی نہ کسی
صورت میں صادق آئیں گی۔ یقین سے بڑا ادب پیدا ہوا ہے لیکن یقین حاصل کرنے کے ذرائع مختلف
ہو سکتے ہیں۔ اور شاعروں اور ادیبوں کے لئے یہ ہرگز لازمی نہیں ہے کہ وہ اپنے دور کے مروجہ اقدار
یا نظامِ اقدار پر ضرور یقین اور بھروسہ کریں۔ پھر اعلیٰ ادب میں ایک ایسا حصہ بھی ہے جو قاری کو کسی
قدر پر ایمان لانے یا یقین کرنے کی تلقین نہیں کرتا۔ بلکہ اس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ مروجہ ایقانات
کا پردہ فاش کر کے قاری کو نئے سرے سے تجسس اور تفکر پر آمادہ کیا جائے۔

اس لئے نظریے سے معتقدات، یقین یا ایمان مراد لیا جائے تو اُسے اعلیٰ ادب کی ضروری
شرط قرار دینا دشوار ہے۔ ہاں اگر نظریے سے کسی ذہنی یا جذباتی سمت مراد ہے۔ تو یقیناً اُسے
اعلیٰ ادب کی پہچان کہا جا سکتا ہے۔ یہ ذہنی اور جذباتی سمت اکثر احساس اور جذبے فکر اور بصیرت
کے امتزاج سے پیدا ہوتی ہے۔ بڑا ادیب اپنے گرد و پیش کے مسائل سے بے تعلق نہیں رہ سکتا۔
وہ ان کو عام طور پر اپنے دماغ اپنے اعصاب اور اپنے احساسات کے ذریعے سے دیکھتا، محسوس
کرتا اور سمجھتا ہے اور ان سے اپنے طور پر کوئی نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ سوال اٹھاتا
ہے اور ان کے جواب ڈھونڈھتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے نتائج کبھی پہلے سے اخذ کئے
ہوئے نتائج سے مماثل ہو جائیں۔ اور اس کی انفرادی بازیافت کسی اجتماعی فلسفے یا نظامِ اقدار
سے ہم آہنگ ہو جائے۔ اس کی ایک مثال اقبال کا تصورِ اسلام ہے جو روایت کے طور پر
اختیار نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس تک اقبال کی رسائی اپنے تجربات اور اپنی فکر کے ذریعے سے
ہوئی ہے۔

مجھے علم ہے کہ نظریے عقیدے یا خیال اور تجربے کے خلوص پر فن کا دارومدار قرار دینا
پوری طرح درست نہ ہوگا۔ یہ اعلیٰ ادب عام طور پر خلوص سے پیدا ہوتا ہے مگر کامیاب ادب

ؤں میں سے ایسے بھی ہیں جن کو پوری طرح خلوص کی تخلیق نہیں کہا جا سکتا تھا۔ سودا۔ ذوق
ب اور مومن کے قصائد کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اِن کی ادبی چاشنی۔ اور
ی کاری مسلم مگر سودا کو عمدۃ الملک سے، ذوق اور غالب کو بہادر شاہ اور ملکہ وکٹوریہ
ے اور مومن کو راجہ اجیت سنگھ سے خلوص ہونا معلوم!

بہر حال اس بحث سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ نظریہ ہو یا یقین، مذہب یا معتقدات
ی بھی حسن کاری میں مخل نہیں ہوتے بلکہ شخصیت میں جس قدر زیادہ خود آگہی اور کائنات
ی ہوگی۔ اسی قدر حسن کاری میں زیادہ پہلو داری اور کیفیت پیدا ہوگی۔ یہ ادب پارے
عقیدے کے نام پر بھی اسی قدر بے کار پھیکے اور بے کیف ادب پارے لکھے گئے ہیں۔
نے عقیدے کے بغیر لکھے گئے ہیں لیکن حسن کاری کا خون عقیدے کی گردن پر نہیں ہے شاعر
ی محدود صلاحیتوں کے سر ہے۔

ذاتی فلسفۂ حیات کے بارے میں کہا گیا ہے کہ فلسفۂ حیات ہر شخص کا ہوتا ہے۔ کچھ
گ اسے سوچ سمجھ کر اختیار کرتے ہیں اور اکثر بے سوچے سمجھے اسے برتتے ہیں اور انہیں اپنے
سفۂ حیات کا علم بھی نہیں ہوتا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ دشمن کی فوج کی تعداد جاننا اس قدر
روری نہیں ہے جتنا کہ اس کے فلسفۂ حیات سے واقفیت ضروری ہے۔ کچھ لوگ چند محول سے
ا کام لیتے ہیں۔ بعض معمولی کاموں کے لئے بھی عظیم وسائل کی فراہمی لازمی سمجھتے ہیں۔ کچھ
وے بہ جد و جہد گر نشد حاصل مراد کے قائل ہوتے ہیں کچھ حوالہ بہ تقدیر کے۔ اسی طرح ہر ادیب
ا بھی ایک فلسفۂ حیات ہوتا ہے۔ خواہ شعوری ہو یا غیر شعوری۔ لیکن عظیم شاعر اور ادیب شعوری
طور پر اپنا نقطۂ نظر بناتا ہے اور اسے مرتب اور منظم کر کے فلسفۂ حیات کی شکل دیتا ہے۔
ظیم ادیب انسان اور کائنات کے رشتے کے بارے میں بنیادی سوال اٹھاتا ہے اور انہیں اپنے
طور پر حل کرتا ہے۔ لہٰذا عظیم ادیب محض اپنی ذات کے شکستہ کنگوروں میں محصور نہیں رہ
سکتا وہ اِن سے آگے بڑھ کر اپنے عصری مسائل کے بارے میں ایک رویہ اختیار کرتا ہے اور
ان عصری مسائل میں وہ زندگی اور کائنات کے وسیع مسائل کا عکس دیکھتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے۔ ادب کی تخلیق انسانی شخصیت کی

دو سطحوں سے مل کر ہوتی ہے۔ شعور اور ماسوائے شعور۔ شعور میں عزم اور ارادے کو دخل ہے بصیرت اور فکر کو دخل ہے۔ لیکن ماسوائے شعور دراصل اجتماعی احساس، روایات، سماجی تصورات دیو مالا۔ اساطیری قصے، بڑی بوڑھیوں کے ہونٹوں سے سنی ہوئی لوریاں اور کہانیاں ڈھولک کے گیت غرض ان گنت اقسام کے تجربات اور احساسات شامل ہوتے ہیں۔ جنہیں اجتماعی لاشعور کا نام بھی دیا جا سکتا ہے اور انسان کی اصلی شخصیت کہا جا سکتا ہے۔ مگر اگر صرف شعور پر اثر انداز ہوتی ہے تو فن نہیں بنتا۔ وہ ذہن کی آواز ہو سکتی ہے۔ پورے وجود کی آواز نہیں بن پاتا اصل بصیرت وہ ہے جو انسان کی پوری شخصیت کا جزو بن جائے۔ اور غفلت کے لمحوں میں بھی اس کی حرکات و سکنات، قول اور فعل سے ظاہر ہو۔ اس لئے یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ پیغام رسانی یا ابلاغ کی انتہا یہی ہے کہ کہنے والوں کو وہ پیغام یا شعوری کوشش معلوم نہ ہو بلکہ اس کی باتوں سے بے ساختہ اس کا اظہار ہو اور اس میں کاوش کو کم سے کم دخل ہو یہی بات نظریہ کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ نظریہ کی معراج یہی ہے کہ وہ دل و دماغ ہی تک محدود نہ رہے بلکہ پوری شخصیت میں گھل مل جائے اور ادیب اور فن کار کو یہ احساس ہو کہ وہ کسی خاص نظریے کی ترجمانی اور تبلیغ نہیں کر رہا ہے۔ بلکہ صرف اپنی شخصیت کا اظہار کر رہا ہے۔ یہیں داخلیت اور خارجیت کی حدود ملتی ہیں۔ اور فن کارانہ حقیقت کا جنم ہوتا ہے جب تک نظریہ صرف دماغ کو ایمان بخشنے اور دلوں میں سرائت نہ کرے رگوں میں خون بن کر دوڑنے پھرنے کے قابل نہ ہو اور فن کاری کی نجی خواہشات اور داخلی زندگی کی ڈھرکنوں میں حلول نہ کر سکے اس وقت تک ادبی صداقت کو جنم دینے کی اعلیٰ صلاحیت تک نہیں پہنچتا۔

(۲)

بہر حال ان معروضات سے یہ واضح ہوا ہوگا کہ فن کار صرف "دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لئے پھرنے والا" انسان نہیں ہوتا وہ دانش ور بھی ہوتا ہے اور اسی لئے اس کا فریضہ صرف اپنی نجی سرگزشت کو دہرانا نہیں ہے۔ بلکہ اس نجی سرگزشت میں سماجی معنویت اور کائناتی آہنگ پیدا کرنے کا بھی ہے۔ خصوصاً ہمارے عہد میں جب علم اور بصیرت چند طبقوں یا ماہروں کی میراث نہیں رہی ہے۔ جہاں رموزِ مملکت صرف "خسرواں" پر نہیں چھوڑے جا سکتے

ادیب کو دانش ور کی حیثیت سے بھی اپنے فریضے کو پہچاننا چاہئے۔

ایک سیاستدان نے کچھ دن ہوئے کہا تھا کہ امنِ عالم کو صرف چند فوجی افسروں کی مرضی پر نہیں چھوڑا جا سکتا یہ اس سے زیادہ سنجیدہ مسئلہ ہے۔ یہی بات سیاستدانوں کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ دنیا کے مستقبل کو صرف سیاستدانوں پر نہیں چھوڑا جا سکتا جو ہر مسئلے کو الجھا کر اُسے انسانیت کے لئے ایک مستقل خطرہ بنا لیتے ہیں۔ انسانیت کے مستقبل کی تعمیر و تشکیل میں دانش وروں کو سیاستدانوں سے زیادہ اہم حصہ لینا چاہئے۔

یہ بات نہایت شد و مد سے کہی جاتی ہے لیکن اکثر کہنے والے اس کا مطلب نہیں سمجھتے۔ والٹیر۔ روسو۔ بائرن۔ گوئٹے۔ گورکی اور میکافسکی کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی وہ اکثر یہ بات بھول جاتے ہیں کہ ادیبوں کی انفرادیت اور انانیت اس قدر پرشور اور تابناک ہوتی ہے کہ وہ اپنے عہد کے سیاسی رہنما یا عام سیاسی اور سماجی فلسفے کی آنکھ بند کر کے تقلید نہیں کرتے۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور اپنے کانوں سے سنتے ہیں۔ اور اپنے عہد کے بڑے سے بڑے ہیرو یا سیاسی رہنما سے متاثر ہوئے بغیر اپنے تجربات، احساسات اور خیالات کی روشنی میں نیا راستہ بناتے ہیں۔ اور اس پر بے دھڑک چلتے ہیں۔ اس روشنی سے آگے چل کر دوسرے لوگ جن میں سیاسی رہنما بھی شامل ہوتے ہیں اپنے چراغ جلاتے ہیں۔

مثال کے طور پر خود ہمارے دور کو لیجئے۔ اس دور میں جب ایٹم بال باندھی تلوار کی طرح انسانیت کے سر پر لٹک رہا ہے۔ نصف دنیا اشتراکیت کی طرف مائل ہو چکی ہے۔ قومیں آزادی کی خون ریز لڑائی لڑ رہی ہیں۔ آزادی، انصاف، سماجی مساوات کے نعروں سے دنیا گونج رہی ہے۔ مارکسی نظامِ فکر میں بہت کچھ تبدیلیوں کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے اور نئے عقائد جنم لے رہے ہیں اس وقت بھی مالرو جیسا ادیب ڈی گال جیسے آزادی دشمن رہنما کا ہم نوا ہے ہندوستان میں اکثر ادیب اور دانش ور پنڈت نہرو سے اپنی فکر کے چراغ روشن کر رہے ہیں روس اور چین اور دوسری اشتراکی جمہوریتوں میں ادیب سیاسی رہنماؤں اور دستاویزوں کی روشنی میں اپنے ضمیر کی تلاش کر رہے ہیں۔

یہ ایک الگ سوال ہے کہ دنیا کے ادیب کیونکر سیاسی گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہیں اور وہ

کیوں اِن جزوی وفاداریوں سے بلند ہو کر ایک عالمگیر انسانی برادری کا خواب نہیں دیکھ سکتے۔ کیوں وہ اپنی بصیرت اور اپنی دانش کو سطحی سمجھوتوں سے بلند نہیں کر سکتے۔ میں یہاں اپنی بحث کو صرف ہندوستانی ادیبوں تک محدود رکھوں گا۔

ہندوستانی ادبیات میں عموماً اور اردو ادب میں خصوصاً پچھلا دور ترقی پسند تحریک کا دور تھا جو سیبرز کی طرح آئی۔ اِس نے دیکھا اور اِس نے فتح کر لیا" کے مصداق ادبی افق پر چھا گئی۔ اِس دور میں جب ہندوستان میں قومی آزادی، سماجی انصاف اور اقتصادی مساوات کی لڑائی جاری تھی ترقی پسندوں نے ادب کی سماجی افادیت اور ذمہ داری پر زور دیا اور اسے "صنوبر کے سالوں" سے نکال کر حقیقت کی سرزمین پر لا کھڑا کیا۔ اِس وقت ذہنی قیادت بہت کچھ ترقی پسندوں کے ہاتھ میں تھی مگر عوام کی باگ ڈور (اور بہت کچھ اس میں جذباتیت کو بھی دخل تھا) اور سیاسی رہنمائی کانگریس کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن ۱۹۴۸ سے تنگ نظری کے دور کے بعد جب ترقی پسندی ایک نظام فکر کے بجائے ایک سیاسی پارٹی کے پروگرام کے مترادف سمجھی جانے لگی اور ۱۹۵۰ میں اِس نقطۂ نظر کی ناکامی اور پھر ۱۹۵۶ء میں اسٹالن کی عظمت سے انکار کے بعد یہ ذہنی قیادت بھی حکومت کے ہاتھ میں پہنچ گئی اور آج بہت سے ادیبوں کے ہاں بہرد کی فکر اور ٹیگور کی ادب نوازی کی پرچھائیاں مل سکتی ہیں۔ اُردو میں اس کا ایک ردعمل یہ بھی ہوا کہ ترقی پسندی کے دورِ شباب میں جس طرح اکثر ادیبوں نے انفرادی طور پر غور و فکر کرنے کے بجائے پارٹی یا ادارے کے سوچے سمجھے نعروں پر اعتماد کرنے کی عادت اختیار کر لی تھی اسی طرح ترقی پسندی سے بیزار ہو کر بہت سے نوجوان ادیبوں نے ذمہ دارانہ غور و فکر ہی سے دامن چھڑانا شروع کیا۔ اور انسانیت، زندگی، اور ملک و قوم کے مسائل سے بچ کر وہ محض نجی سرگذشت اور داخلی حصار میں خود کو آسودہ اور مطمئن محسوس کرنے لگے۔ کچھ ادیب سرکاری طرزِ فکر کے مروجہ انداز کو قبول کرنے لگے اور ہندوستانی زندگی کے تاریک گوشوں پر سے نقاب اٹھانے کی ہمت بہت کم ادیبوں میں باقی رہ گئی۔

(۳)

اِس وقت ہندوستان کی سماجی زندگی میں ادیب کی ذمہ داری کیا ہے؟

اختر شیرانی۔ جوش اور مجاز کا زمانہ ختم ہو گیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہیئے کہ اب رومانی سرمستی۔ جذباتیت، انقلابی گھن گرج کا دور ہے، اور نہ مجاہدانہ جوش اور ولولے کا۔ سیاسی غلامی کتنی بڑی ہی لعنت سہی اس نے یہ کام ضرور کیا تھا کہ ہمارے ادیبوں میں ہم آہنگی اتحاد اور جوش پیدا کر دیا تھا۔ سارے اختلافات صرف اس ایک آواز، ایک نعرے کی بدولت مٹ گئے تھے۔

سیاسی آزادی کا طلوع ہوا اور اس کے ساتھ ہی یہ متحدہ محاذ شکست ہو گیا۔ ادیبوں میں سے اکثر نے آزادی کا جو تصور قائم کیا تھا۔ اس میں سماجی انصاف، اقتصادی مساوات اور آزادیٔ فکر کے عناصر ضرور شامل تھے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد پے در پے بہت سے ہنگامے اٹھ کھڑے ہوئے آزادی کے جلو میں ملک کی تقسیم اور وہ بھی مذہب کی بنیاد پر۔ اس کے بعد فرقہ وارانہ فسادات کی لہر نے دلوں کے بنے ہوئے رکھ رکھاؤ، برس ہا برس کی اقدار اور تصورات کو پل بھر میں توڑ مروڑ کر رکھ دیا سنجیدہ ترقی پسند اور انسانیت دوست فن کار اور دانش ور یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ مذہب کو سیاست کی بنیاد قرار دینا شاید بہت زیادہ غلط نہیں ہے، شاید ہندوستانی اب بھی ایک قوم نہیں ہیں۔ بلکہ مذہب کے بنیاد پر قائم کی ہوئی ایک دو یا دو سے زیادہ قومیں ہیں۔ کسانوں اور مزدوروں کی ساری تحریکیں جن سے تمام دانش وروں نے امیدیں قائم کر رکھی تھیں مذہب کے نام پر بٹ کر کمزور ہو گئیں۔ مہاتما گاندھی کے انسانیت دوستی، عدم تشدد اور اہمسا کے فلسفے جن سے بہت سے دانش ور متاثر ہوئے تھے۔ فرقہ وارانہ فسادات کی آگ کی نذر ہو گئے۔ جب گاندھی جی کی آواز کو ایک ہندوستانی نے ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا تو ہندوستان میں جمہوریت اور اہمسا کے مستقبل پر ایمان ڈگمگا گئے۔

اسی کے ہمرکاب ایک اور بحران آیا۔ ۱۹۴۸ء میں بین الاقوامی سطح پر ژدانوف نے اور ہندوستان و پاکستان کی سطح پر بی۔ ٹی۔ رندیوے نے اشتراکی انقلاب کی آواز بلند کی۔ استدلال یہ تھا کہ دنیا اب کھلم کھلا دو کیمپ میں بٹ گئی ہے ایک اشتراکی طاقتوں کا کیمپ ہے جس کی رہنمائی روس اور اسٹالن کر رہے ہیں۔ اور دوسرا کیمپ سامراجی طاقتوں کا ہے۔ اسی تصور کے تحت نو آبادیاتی ملکوں میں سے نئے آزاد ممالک کو سامراجی طاقتوں کے رفیق سمجھا گیا۔ اور خود ہندوستان میں اشتراکی انقلاب کی تحریک شروع ہوئی یہ انقلاب تلنگانہ کی فتح سے چل کر کل ہند پیمانے پر ریل ہڑتال تک پہنچنا باقی تھا کہ اچانک ریلوے کی ہڑتال کی زبردست ناکامی نے تمام انقلاب دوستوں کو اپنے تصورات پر نظر ثانی کرنے پر

مجبور کیا۔ اور آخر کار ۱۹۵۵ء میں یہ بات تسلیم کر لی گئی کہ انقلاب کی صداقبل از وقت تھی اور جس مارکسی تصور کا سہارا لیا گیا تھا اس کا محض میکانکی پہلو پیشِ نظر رکھا گیا تھا۔ یہ صحیح مارکسی تصور نہ تھا۔ اور اس تصور کے ماتحت جو اقدامات کئے گئے تھے وہ صحیح اقدامات نہ تھے۔

اسی تنگ نظر میکانکی تصور کے ماتحت ترقی پسند مصنفین کی کاٹ چھانٹ ہوئی تھی۔ بھیمڑی میں ایک اشتراکی انقلابی منشور طے کیا گیا تھا اور بمبئی میں ساغر نظامی، خواجہ احمد عباس اور ملک راج آنند سے زیادہ قریبی انقلابی وفاداری کا تقاضہ کیا گیا تھا جب ۱۹۵۰ء میں یہ ساری پالیسی غلط قرار دی گئی تو یہ تبدیلی انتشار کو کم نہ کر سکی۔ اور کھوئے ہوئے اعتماد کو واپس نہ لا سکی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس تبدیلی کے بعد بھی عرصے تک اشتراکی جماعتیں کوئی واضح نظریاتی لائحہ عمل اختیار نہ کر سکیں اور آج بھی یہ فکری انتشار باقی ہے۔

اسی زمانے میں ایک طرف ہندوستانی کی خارجی پالیسی نے بین الاقوامی سطح پر خراج تحسین حاصل کیا۔ کوریا پر۔ ویتنام کے مسئلے پر جنیوا کانفرنس میں چین کے داخلہ یو۔ این۔ او کے سوال پر اور بعض دوسرے بین الاقوامی مسائل پر ہندوستان کے نمایندوں نے قدرے آزادانہ رویہ اپنانے کی کوشش کی۔ دوسری طرف ہندوستان کے پنج سالا پلان کا چرچا سنا جانے لگا۔ زمینداری کا خاتمہ ہوا۔ فرقہ وارانہ فسادات ختم ہوئے ریاستوں کے رجواڑے اکثر جگہ بے نام و نشان ہو گئے۔ ہندوستان نے امریکہ کے ساتھ ساتھ روس سے بھی دوستی قائم کی۔ اور آخر کار کانگریس نے اپنا مطمحِ نظر سوشلزم کو قرار دیا گو اس کی توجیہہ تفسیر اور طریقۂ کار کی وضاحت اپنے طور پر کی۔ اس کے بعد کانگریس میں پبلک اور پرائیوٹ سیکٹر کے الفاظ سنے جانے لگے۔ بیمہ کمپنیوں کو قومی ملکیت قرار دیا گیا۔ اور اب کوآپریٹو اور بھودان کے ذریعے زرعی نظام کا کوئی اجتماعی حل ڈھونڈھنے کی کوشش ہونے لگی۔ بڑے بڑے انجینرنگ کے کارنامے وجود میں آنے لگے۔ بھاکرا ننگل۔ دامودر ویلی۔ جیسے عظیم الشان کام پورے ہونے لگے۔ جن سے ایک بار پھر ہمارے ادیبوں اور مفکروں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید ملک جس سمت جا رہا ہے وہی سلامتی اور بھلائی کا راستہ ہے۔ اور آج بھی جواہر لال نہرو کی کانگریس ملک کی رہبری کرنے کی سب سے زیادہ مستحق ہے۔ یہ بات بذاتہ صحیح ہو یا غلط لیکن اس کا انجام یہ ضرور ہوا کہ ہمارے ادیبوں کی ذہنی قیادت بہت کچھ جواہر لال نہرو اور ریاست کے ہاتھ میں بھی آ گئی۔ اور ہمارے کلچر کے

سب سے بڑے نمائندہ گیسکر اور ہمایوں کبیر سمجھے جانے لگے۔ اس کے علاوہ ہمارے ادیبوں میں سے اکثر میں جرأت فکر اور آزادیٔ رائے کا فقدان ہونے لگا۔ اور وہ اپنے خوابوں کو بھول گئے جو جمہوریت، انصاف اور مساوات قائم کرنے کے لئے دیکھتے آئے تھے۔ یہی نہیں بلکہ اِن کی نظریں کاغذ پر بنے ہوئے خوبصورت منصوبوں اور نقش و نگار میں اس قدر الجھ کر رہ گئیں کہ وہ گرد و پیش کی سنگین حقیقتوں پر غور نہیں کر سکے۔ اُنہوں نے یہ یقین کر لیا کہ ہندوستان میں سب خیریت ہے۔ اور بھاکڑا ننگل اور دامودر ویلی کی تکمیل کے بعد ہر گاؤں میں بجلی اور ہر قصبے میں خوشحالی کی لہر دوڑ جائے گی۔ اِن میں سے اکثر یہ نہ دیکھ سکے کہ اب بھی ہندوستان سے غریبی۔ جہالت، مرض تعصب، چھوت چھات اور تنگ نظری کم نہیں ہوئی ہے۔ اب بھی بے روزگاری قدم قدم پر ملتی ہے اب بھی ہندوستانی ایک انسان نما جانور کی زندگی گذارنے پر مجبور ہے۔ آج بھی ہندوستان کے مسائل کا عشر عشیر حل نہیں ہوا ہے اور اِس کے حل کرنے کی کوشش بھی اکثر جگہ صحیح طور پر نہیں کی جا رہی ہے۔

آج کے مسائل گنوانے سے پہلے فکری تبدیلی کے اِن اسباب کا تذکرہ پورا کرنے کے لئے اسٹالین کی موت کے بعد روس کی سیاست کے انتشار کا ذکر ضروری ہے۔ بیریا اور اس کے بعد مالنکوف کی برطرفی معمولی حادثات نہ تھے! اور اس کے بعد خروشچیف نے اسٹالین کی شخصیت سے جس طرح عقیدت کے سارے پردے اتار پھینکے اور اسٹالن کے گندے پہلوؤں کو بے نقاب کیا اس سے خیالات میں ایک زلزلہ آ گیا۔ پھر ہنگری اور پولینڈ کے واقعات اور مارشل ٹیٹو کی نظریاتی جدوجہد نے یہ ثابت کر دیا کہ مارکسیت کا صرف ایک سکہ بند تصور تسلیم کر لینا مناسب نہیں۔ اور کمیونسٹ سیاسیات میں بھی سب کچھ بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی مارکس ازم کو اِس قدر آسانی سے رد کر دینا غلط ہوگا مارکسیت کو ایک نظام فکر کی حیثیت سے ابھی ہمارے دانش وروں نے پوری طرح پرکھنے میں کامیابی حاصل نہیں کی ہے۔ مارکسیت سے لگاؤ علمی کم تھا۔ جذباتی زیادہ تھا۔ اس پر نئے سرے سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

ادھر ایک اور حادثہ یہ ہوا کہ عرب۔ افریقی اور ایشیائی ممالک میں بیداری کی ایک نئی لہر آئی۔ چین آزاد ہوا۔ ویٹ نام میں جنگ آزادی شروع ہوئی۔ برما۔ لنکا۔ انڈونیشیا۔ ملایا آزاد

ہوئے۔ ایران میں مصدق کی آواز گونجی۔ مصر میں پہلے نجیب پھر ناصر نے تیزی کے ساتھ برطانوی
امریکی سامراج کے چنگل سے نکلنے کی کوشش کی۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی احساس پیدا ہو
بعض ایشیائی۔ عرب اور افریقی ممالک ایسے ہیں جو امریکی اور روسی دونوں بلاکوں سے آزاد ر
چاہتے ہیں۔ اور صرف چند بنیادی تصورات پر متفق ہیں۔ چین اور ہندوستان کے وزرائے اعظم
پنچ شیل کا نعرہ بلند کیا۔ اور بانڈونگ کانفرنس کے بعد دونوں بلاک سے آزاد چند ممالک کا ا
نیا گروہ سامنے آیا۔ یہ سوال یہاں غیر ضروری ہے کہ اس نئے گروہ کو غیر جانبدار کہا جائے یا
قرار دیا جائے دوست سمجھا جائے یا دشمن۔ بہر صورت اس سے ایک نئی صورت حال ضرور وجود میں آئی

یہ تمام حادثات ایٹم اور ہائیڈروجن بموں کے دھماکوں کے پس منظر میں ہو رہے تھے اور
نیٹ کی دھول انسانیت کے لئے مہلک خطرات کے نئے دروازے کھولتی جاتی تھی سوال یہ
بہتر سے بہتر نظام کی جدوجہد اگر جنگ کی طرف لے جائے تو یقیناً اس سے انسانیت اور تہذیب
کے لئے تباہ ہو جائیں گی۔ اور بہتر نظام قائم ہونے کے بجائے ہر قسم کا نظام برباد ہو جائے گا
لئے امن، جمہوری رواداری اور دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنا اور اسے زندہ رہنے کا حق
خود انسانیت کے تحفظ کے لئے ضروری ہو گیا۔

(۴)

ان تمام حالات کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے ادیبوں کی صفوں میں انتشار پیدا ہوا۔ تر
پسند تحریک کی قوت کم ہوئی اس کا اثر بھی محدود ہوا۔ فرقہ وارانہ فسادات نے مذہب کی طرف
راغب کیا۔ اور قومیت اور بین الاقوامیت کے تصورات کی جگہ تنگ نظری کی طرف متوجہ ک
جمہوریت اور اشتراکیت سے بھی بہت سے حضرات کا ایمان اٹھ گیا۔ مارکسیت کو بھی لوگ
منتقیم سمجھنے سے گریز کرنے لگے۔ ہندوستانی حکومت کا بھی اقتدار بڑھ گیا۔ اور ادیب
اعتبار سے سرکاری اقدامات اور پنچ شیل کے نقطۂ نظر سے متاثر بھی ہوئے۔

آج اردو ادیبوں کی اچھی خاصی تعداد ایسی ہے جو ذمہ دار دانش ور کا مرتبہ پا
چکے ہیں نئے اردو ادیبوں میں سے بہت سے لوگوں نے داخلیت اور خالص عشقیہ انداز کو
لگایا ہے۔ یا پھر کلاسیکی رنگ میں بعض نے بے ضرر اور تفریحی موضوعات تک اپنے کو محدود کر

حالانکہ میں نہ تفریحی موضوعات کا مخالف ہوں اور نہ "ضرب" کو ضروری خیال کرتا ہوں) پھر غزل کا احیا شروع ہوا غزل کی طرف مراجعت کی بنا پر ذمہ دارانہ غور و فکر سے گریز عام ہوا اور شعرا مسلسل اور مربوط خیالات و جذبات کے مسلسل اور مربوط بیان کے بجائے صرف تغزل کی چاشنی اور داخلی سوز و گداز کی رنگینی میں کھو کر رہ گئے۔ اس سلسلے میں میں اپنے مضامین "آزاد نظم غزل اور ترقی پسند شاعری" اور "ایک خطرناک میلان" میں اظہارِ خیال کر چکا ہوں شاعری میں یہ رجحان غزل کی طرف واپسی، میر کی الم پرستی کی طرف رجعت اور نظم نگاری کے زوال کی شکل میں رونما ہوا۔ افسانے میں بھی بے یقینی داستان طرازی قدیم رنگ کے چٹخارے اور خالص عشق و عاشقی کی نرم و نازک کہانیوں میں ظاہر ہوئی جن میں ہلکی سی سماجی معنویت شامل کر دی جاتی تھی۔ تنقید میں سلجھے ہوئے سائنٹفک مضامین کے بجائے ذاتی یادداشتوں اور تاثراتی (ESSAYS) انشائیہ کا چلن عام ہوا اور مجموعی طور پر ہمارا ادب سنجیدہ وسیع اور گہرے فکر سے بہت کچھ الگ ہٹ کر ذات کی بھول بھلیوں اور انداز بیان کی رنگینیوں میں گم ہونے لگا۔

اس بات پر اصرار کرنا بے جا ہے کہ ہر دور کے ادب اور ادیبوں کی ایک ہی سمت ہونی چاہیے ادب اور ادیب ایک لکیر کے فقیر نہیں ہو سکتے۔ ان میں کچھ ایک بات کو صحیح کہیں گے کچھ دوسری کو مگر جس بات پر اصرار کرنا مناسب ہے وہ یہ ہے کہ ادیب زندگی اور اس کے گوناگوں مسائل پر ذمہ داری کے ساتھ غور و فکر کی سکت رکھتے ہوں وہ علم و دانش کا مرتبہ بھی سنبھال سکیں وہ اپنی آزادی کی بات کریں تو بھی اپنی سماجی ذمہ داریوں سے غافل نہ ہوں مختلف گروہ ہو سکتے ہیں۔ مختلف راستے اور لائحہ ہائے عمل بھی ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ راستے اور یہ منزلیں سنجیدہ غور و فکر جذباتی خلوص اور بصیرت کی تخلیق ہوں۔ ذہنی بے راہ روی اور غیر ذمہ داری کے پیدا کردہ نہ ہوں۔

آج بھی ہندوستان کی سماجی زندگی کا گوشہ گوشہ ادیبوں کی بصیرت کو للکار رہا ہے غلامی کی شب تاریک کی سحر ہو گئی۔ مگر اقتصادی غلامی کا جوا ہم سب کے کاندھوں پر رکھا ہوا ہے جہالت کا کوڑھ پوری قوم کو داغدار بنا رہا ہے۔ چھوت چھات تعصب مذہبی تنگ نظری۔ فرقہ دارانہ

حماقت آج بھی اسی طرح موجود ہیں۔ آج بھی ہندوستان سماج انصاف۔ مساوات اور جمہو
کے لئے اسی طرح تڑپ رہا ہے اور جس قسم کے سوشلزم کا تصوّر پھیلایا جارہا ہے وہ لوگوں
مسائل کو حل نہیں کرپاتا۔ اس کے نام پر آج بھی سرمایہ دار، نوکرشاہی اور ہر قسم کے گرگے
کا خون چوس رہے ہیں۔ پرائیویٹ تاجر اب بھی حکمراں ہے۔ اور پلان کے ان گنت منہ
دوڑ کیلا بھیلائی۔ بھاکرا ننگل۔ دامودر ویلی۔ اور لاتعداد کارنامے آج بھی عام ہندوستانی
زندگی کو بہتر بنانے میں ناکام ہو رہے ہیں۔ کیونکہ ان کی برکات براہِ راست عوام تک نہیں پہنچ رہی
ہیں۔ بیروزگاری کا بھوت ہر گھر پر منڈلا رہا ہے۔ اور مستقبل ایک نیم تاریک اور نیم روشن
سے جھانک رہا ہے۔

اِن سب حالات کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑا بحران جسے صرف ادیب اور دانش ور اچھی طرح
دیکھ سکتے ہیں۔ ہندوستان کی تہذیبی زندگی میں آگیا ہے۔ یہ بحران کردار اور شخصیت کا بحران
ہمارے اردگرد ایسے لاتعداد انسان بس رہے ہیں جو بے یقینی۔ کم ہمتی اور زبوں کرداری کے
شکار ہیں۔ یہ بہت کچھ ہماری قومی اور سیاسی زندگی کی دین ہے۔ کچھ ہماری اپنی زبوں حالی کا
نتیجہ ہے۔ سیاسی سطح پر ہم سوشلزم کا دم بھرتے ہیں اور پرائیویٹ تجارت کے حامی ہیں۔ ہمارے
سب سے بڑے سیاسی ادارے میں پرشوتم داس ٹنڈن اور جواہر لال نہرو دونوں بیک وقت
ہیں۔ حالانکہ ان دونوں میں کوئی قدر مشترک نہیں۔ ہم سیکولر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اور بدھ
جینتی مناتے ہیں۔ دلائی لاما کے مسئلے پر تبت سے اپنی مذہبی یگانگت کا واسطہ دیتے ہیں۔ اور انڈیا اور
بھارت دونوں کو اپناتے نہیں شرماتے۔ ہم غیر مذہبی اور جمہوری ہیں۔ اور اس نقطۂ نظر سے
فرقہ واریت اور مذہبی تنگ نظری گناہ ہے۔ ہم ایک طرف اکبر کے حامی ہیں۔ اور دوسری طرف
پرتاب اور شیواجی کے۔ ایک طرف ہم کوآپریٹو کھیتی کے حامی ہیں۔ اور دوسری طرف نندا اور منشی
کے ہم آواز ہوکر اس کے مخالف ایک طرف ہمارے بڑے سے بڑے قومی رہنما زبانوں کی مکمل
آزادی کا اعلان کرتے ہیں۔ اور اردو کو اس کے حقوق دلانے کا کھلم کھلا وعدہ کرتے ہیں
اور دوسری طرف اس کو علاقائی زبان کا مرتبہ دلانے میں بھی اپنے کو بےکس اور مجبور محسوس
کرتے ہیں۔ اس فکری دورنگی کا انجام یہ ہوا ہے کہ ہر سطح پر ہمیں ایسے افسروں۔ نوجوانوں

ہبروں۔ دانش وروں اور سیاسی رہنماؤں سے سابقہ پڑتا ہے جن کے الفاظ کچھ اور ہیں
ور عقائد کچھ اور۔ دل میں وہ نہایت متعصب، تنگ نظر، سرمایہ پرست، اور سوشلزم دشمن
جعت پسند ہیں۔ اور تحریر و تقریر میں وہ انتہائی ترقی پسند، فراخ دل، سوشلسٹ اور قوم پرست
ی نئی نسل میں سے اکثر نوجوانوں نے اس سے آگے بڑھ کر صرف موقعہ پرستی کو اپنا مذہب
بنا لیا۔ اِن میں سے اکثر بہ یک وقت جن سنگھی، کمیونسٹ، کانگریسی، روس کے مداح
و امریکہ کے دلدادہ سب کچھ ہو سکتے ہیں۔ اور موقعہ موقعہ سے ہر ایک سے فائدہ اٹھانے
جائز سمجھتے ہیں۔ آج ضمیر اور کردار سے زیادہ سستی اور کوئی چیز نہیں ہے۔

کردار اور جرأتِ فکر کا یہ بحران جمہوریت کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے جب تک ہمارا
قومی مزاج جرأتِ عقیدے اور خلوص کا پرستار نہ بن جائے اس وقت تک اس ملک میں
انصاف اور جمہوریت کا مستقبل محفوظ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ظاہر ہے کردار کے اس زبردست
بحران کو جس طرح ادیب اور دانش ور محسوس کر سکتے ہیں۔ اور اس کا مداوا کر سکتے ہیں اس
طرح دوسرے بہت کم کر سکتے ہیں

اِن حالات میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہندوستانی ادب آج اپنے تاریخی دور سے گذر رہا
ہے۔ اس کی انگلیاں عظیم انسانی مسائل پر ہیں۔ ہمارے ادیب عظمت کے دور میں پیدا ہوئے ہیں
جب سنگین حقیقتیں تخلیقی فکر کو للکار رہی ہیں۔ اور حل کے لئے بیتاب ہیں۔ ایسے دور میں ذہنی اور
مجبوری دشواریوں سے رنجور ہو کر یقین کی دولت کھو دینا اور اپنے فریضے کو بھول جانا دانش
وروں کے شایانِ شان نہیں۔ آج اس بات کی پھر ضرورت ہے کہ ادیب اپنی سماجی ذمہ داریاں
پہچانیں وہ گرد و پیش کے گونجتے گرجتے حقائق سے آنکھیں بند نہ کریں۔ بلکہ ان پر توجہ کریں
ہندوستان اور انسانیت کی سماجی لعنتوں کو دور کرنا اور سماج کو بہتر بنانے کی جدوجہد میں
حصہ لینا آج بھی ادیبوں کا پہلا فریضہ ہے۔ خصوصاً اس وقت جب کہ سیاسی آزادی کے لئے
ہماری سماجی زندگی کی محرومیاں۔ کمزوریاں اور گندگیاں پوری طاقت کے ساتھ اُبل پڑی ہیں
آج ادیب کو پھر سماجی انقلاب۔ آزادی۔ مساوات اور انصاف کی آواز بلند کرنی چاہیئے
ادب میں قوت اور کس بل ہمیشہ ذہنی آزادی اور جرأتِ افکار سے آئی ہے آج بھی یہی

منصب بھی کس بل ادیبوں کو دعوتِ فکر دے رہا ہے ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک نے جو
اپنایا تھا اس کی تکمیل اور تعمیل آج بھی باقی ہے۔

وقت اور مسائل کی اس للکار کا جواب جذبے کے خلوص اور فکر کی سنجیدگی سے ہی دیا
جاسکتا ہے آج اگر ہمارے ادیب اور دانش ور مارکسیت یا سوشلزم کو ایک نظریے کی حیثیت
سے تسلیم نہیں کرتے تب بھی ان کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اس کے متوازی کوئی دوسرا نظام
اقدار پیش کریں۔ اگر وہ سوشلزم یا مارکسیت کے چند بنیادی تصورات سے متفق ہیں اور چند سے
اختلاف رکھتے ہیں تب بھی ان کا فرض ہے کہ وہ اپنے خیالات کو سنجیدگی اور متانت کے
ترازو پر تولیں۔ اور اس نظامِ اقدار پہ دوبارہ سوچنے کی دعوت دیں۔ اگر وہ اپنا کوئی الگ
نقطۂ نظر پیش کرنا چاہتے ہیں۔ تو انہیں اس کی بھی پوری ذمہ داریاں سنبھالنی چاہئیں۔ نظامِ
اقدار اور طرزِ فکر کے اختلافات کے باوجود ہمارے ادیب آج چند بنیادی تصورات پر متفق
ہوسکتے ہیں اور ادب کی بنیادی اقدار کی وضاحت اور ان کو مناسب اہمیت دینے سے
سے مسائل حل ہوسکتے ہیں۔

آج ادب کو اور خاص طور پر اردو ادب کو ایک نئے منشور کی ضرورت ہے ایک ایسا منشور
جس کی بنیاد پارٹی بازی۔ وقتی سیاست اور نعرہ بازی پر نہ ہوں۔ بلکہ صرف ادب کے ضابطوں اور
آداب پر ہوں یہ ظاہر ہے کہ اس منشور کے پیچھے بھی تمام ادیبوں کو متحد کرنا ناممکن ہے لیکن
چند ضروری اقدار کی اہمیت کا اعتراف نئی راہوں کے چند گوشے ضرور روشن کرسکے گا۔

میرے نزدیک یہ اقدار چار ہوسکتی ہیں۔ پہلی یہ کہ ادب کی سماجی ذمہ داری کا اعتراف
کیا جائے اور سماجی تبدیلی میں اس کی اہمیت کو تسلیم کیا جائے ادیب، داخلیت اور ذہنی انفرادیت
کے خول سے باہر نکلیں اور اپنی داخلیت کے دائرے کو وسیع کریں۔ خود آگاہ ہونے کے ساتھ
کائنات آگاہ بھی بنیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ہمارے ادیب اور دانش ور ہر قسم کی منافقت
سے دامن بچا کر یہ عہد کریں کہ وہ صرف وہی لکھیں گے جو وہ محسوس کرتے ہیں جو خود ان کے
اپنے جذبات یا ذہن کی آواز ہے۔ اور اس آواز پر کسی قسم کی بندش برداشت نہ کریں۔
ظاہر ہے کہ اس معاملے کی بہت سی نزاکتیں ہیں۔ لیکن پھر بھی اگر خلوص کو تخلیق کا جوہر

ئے تو بہت سی غیر ضروری کثافتیں دور ہو سکتی ہیں۔ اور آرٹ پروپیگنڈہ یا بازاری پن اور
لید محض کی آلائشوں سے محفوظ ہو سکتا ہے۔ نظریہ یا عقیدہ صرف اس وقت خطرناک
جاتا ہے جب وہ خیال کے پاؤں کی زنجیر بن جائے جب وہ سکہ بند ہو کر بے روح بن جائے
دیب کہ بندی خلوص اور پاکیزگی کے سامنے مشکل سے ٹھہرے گی تیسری اہم بات یہ ہے کہ
ہ دار اور سنجیدہ فکر کو ادب میں امتیازی جگہ ملنی چاہئے ادیب محض احساسات کے جگنوؤں کو
ٹنے والا تماشائی نہیں ہے وہ دانش ور بھی ہے اور اس لحاظ سے ادیب سے ذمہ دارانہ اور سنجیدہ
کر کا مطالبہ نا جائز نہیں اس لئے ادیب کا فریضہ یہ بھی ہونا چاہئے کہ وہ اپنے دور کی صداقتوں کو
ں انداز سے بے نقاب کرے کہ اس کا اپنا نقطہ نظر واضح ہو جائے۔ محض جذبے کی اڑان
خیل کی پرواز آج کے ادب کا بنیادی جوہر نہیں بن سکتے۔ آخری قدر اندازِ بیان کے بارے
ہے اندازِ بیان کی مینا کاری اس طرح نہیں ہونی چاہئے کہ وہ نفس مضمون کا پردہ بن جائے
یح صاف اور سادہ اندازِ بیان کو اپنانا چاہئے۔ تاکہ ادب میں فکر سے گریز کا سامان پیدا
ہو۔ اور وہ حقائق و افکار سے توجہ ہٹانے کے بجائے فہم و ادراک جذبے اور احساس
ے زیادہ شدت صلابت اور بصیرت بخشے۔

مختصراً یہ چار باتیں یہ ہیں۔

(۱) ادب کی سماجی ذمہ داری پر زور دینا چاہئے
(۲) ادیب کو چاہئے کہ جو خود محسوس کرے وہی لکھے۔
(۳) ادب کو سنجیدہ اور ذمہ دارانہ فکر کا آئینہ دار ہونا چاہئے
(۴) اندازِ بیان مرصع نہ ہو سادہ ہو تاکہ خیال سے توجہ ہٹ نہ جائے

ظاہر ہے کہ ان چاروں نکات پر بہت کچھ تفصیلی گفتگو کی گنجائش ہے لیکن سر دست ان
سائل کو غور و فکر کے لئے مختصراً پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ مسائل کا احساس ان کے
دراک اور ان کے حل کی پہلی منزل ہوتی ہے

جمیل جالبی

پیسٹرنک بحیثیتِ شاعر

تخلیقی ادب کا یہ بنیادی سوال رہا ہے کہ کیا شاعری کا تصور زمانے کے ساتھ ساتھ
رہتا ہے۔ کیا اب شاعری وہ کام کر سکتی ہے جو گذشتہ کئی سو سال میں وہ انجام نہیں دے سکی
ہے؟ ان باتوں کا جواب دراصل جدید زمانے کے سیاسی سماجی اور معاشی حالات کو سامنے
کر دیا جاتا ہے اس سے پہلے سیاست اور معاشیات سے ادب اس درجہ کبھی وابستہ نہیں
تھا۔ جتنا آج کل ہے اس دور میں بظاہر ادب کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے اور اسے کسی
ملک اور قوم کے تہذیبی اظہار کا ایک مکمل ذریعہ تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر اس اظہار کے
وسیلوں پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ برسرِ اقتدار طبقہ ادب سے دراصل اپنے سیاسی مقاصد
کو آگے بڑھانے کا کام لے رہا ہے۔ وہ ادیب مطعون ہیں جو اس کام میں روڑے اٹکاتے
ہیں اور وہ سر چڑھے ہیں جو اس مقصد کو آگے بڑھانے میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔ اظہار اور
فکر کی وہ آزادی جو ادب کی بنیادی شرط اور ذہنِ انسانی کے ارتقاء کے لئے از بس ضروری
ہے روز بروز کم سے کم تر ہوتی جاتی ہے۔ اور یہ وہ طاعون ہے جو جلد ساری تخلیقی سرگرمیوں
کو اپنی لپیٹ میں لے کر ادب کو ہفتہ وار اخبار کے معیار پر لے آئے گا۔ ایسے ملکوں میں جہاں
کا آورش جمہوریت ہے یہ باتیں ذرا دوسرے انداز کی ہیں۔ لیکن ایسے ملکوں میں جہاں جمہوریت
کے بجائے اجتماعیت کا زور زوروں پر ہے جہاں فرد اپنی انفرادیت کو اجتماعیت میں ضم کر کے
اپنی وحدت سے سبکدوش ہو رہا ہے۔ وہاں یہ بات ذرا کھل کر سامنے آتی ہے اور ایک نئے
آورش کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ایسے معاشرہ میں ادیبوں کو بھی کسانوں۔ مزدوروں اور
سائنس دانوں کی طرح حصولِ مقصد کا آلۂ کار سمجھا جاتا ہے۔ جن کا براہِ راست کام یہ ہے

وہ اپنے طور پر وہ کام انجام دیں جو کھیت، کھلیانوں میں کسان، فیکٹریوں ملوں میں مزدور
گاہوں اور رصد گاہوں میں سائنس داں انجام دیتے ہیں۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں
یب کو نہ تو زندہ رہنے کا حق حاصل ہے اور نہ اِس معاشرہ میں آزادی کے ساتھ زندگی بسر
نے کا۔ اِس طرح ادیب سماجی افادیت اور معاشرتی فلاح و بہبود کی زنجیروں میں جکڑا ہوا
۔ اِس سے بھی ویسے ہی مفید کاموں کی آس لگائی جاتی ہے۔ جیسے اِس انجنیر سے جو
ائی جہاز بنانے کی مشین بناتا ہے یا اِس ڈاکٹر سے جو نزلہ زکام کا علاج دو گولیوں سے
دیتا ہے۔ فرد اور نظریاتی اجتماعیت کی یہی وہ جنگ ہے جو سوویٹ روس میں جاری ہے آپ
یاد ہوگا اور یاد نہ ہونے کی کوئی بات نہیں ہے کہ ہمارے ہاں ایک زمانہ تھا جب امیر امراء
نواب روساء کے دربار ہوتے تھے۔ شعراء اپنی معاش انہی درباروں سے وابستہ ہو کر حاصل
تے تھے۔ اور اِن کی ساری صلاحیت اِس پر صرف ہوتی تھی کہ کس طرح نواب کو خوش کر کے
ت شاہی حاصل کی جائے۔ نواب یا امیر کی قربت کا احساس بالواسطہ احتساب ہونے
باوجود ایک ایسا احتساب تھا جو فنکار کی انفرادیت و ذہانت پہ پہرے بٹھا کر اِس کی فکر
نشو و نما اور پرواز کو روک دیتا تھا۔ لیکن ہمارے ترقی یافتہ مہذب دور میں اب فنکار سے
راست یہ تقاضا کیا جا رہا ہے کہ وہ مخصوص نقطۂ نظر سے سوچے اور مخصوص موضوعات
لکھے تاکہ اِس طرح وہ براہِ راست قومی تعمیر میں حصہ لے سکے۔ اِس احتساب نے اکثر دوسرے تیسرے
جے کے فنکاروں کو سر پر بٹھا دیا ہے۔ اور بہت سوں کو جن میں نہ تو قصیدہ گوئی کی صلاحیت
اور نہ ہفتہ وار رسالوں کا ادب لکھنے کی۔ یا تو خاموش کر دیا ہے یا اُن کے تخلیقی محرکات کو کند
یا ہے۔ پریس۔ پبلشنگ ہاؤس۔ رسالے۔ اخبار سب یا خود حکومت کے ہیں یا پھر حکومت کی
پرستی انہیں حاصل ہے۔ اب ایسے میں فنکار کے سامنے صرف دو راستے رہ جاتے ہیں۔ یا تو وہ
وش ہو جائے یا پھر اِن کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے لگے۔ بورس پیسٹرنک فنکاروں کی اِس
عت سے تعلق رکھتا ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ فنکار کا کام تو صرف اتنا ہے کہ وہ دنیا کو اپنے فن کے آئینے میں دیکھے
آنے والے زمانے کے احساسات و رجحانات کا خاکہ اپنے تخیل کے ذریعہ پیش کرے۔ انسانی احساسات کا تجزیہ کرے اور اپنی
کے تعلق سے پیدا ہونے والے احساسات کو پوری شدت کے ساتھ ظاہر کر دے۔ فن کار تو پورٹ دا ہوتا ہے

پسند ہوتا ہے نہ غیر جانبدار۔ نہ وہ مسلمان ہوتا ہے نہ ہندو وہ تو بنیادی طور پر ایک فن کار ہوتا ہے جس کے اپنے احساسات اور تجربے اس کی دنیا ہوتے ہیں اور انسانیت اس کا دین و ایمان۔ وہ معاشرہ کا ایک حصہ بھی ہوتا ہے اور اس سے الگ بھی وہ اسے دیکھتا بھی ہے اور اس سے بھاگتا بھی ہے وہ تخلیق کے وقت نہ افادیت کا تصور رکھتا ہے اور نہ غیر افادیت کا۔ وہ تو بنیادی طور پر اس بات کا خواہش مند ہوتا ہے کہ جو کچھ اس نے دیکھا اور سوچا ہے جو کچھ اس نے محسوس کیا ہے یا جس چیز کا اسے تجربہ ہوا ہے وہ احساس فکر یا تجربہ اس کی ذات سے کیا تعلق رکھتا ہے۔ اس میں کتنا خلوص اور سچائی ہے اور آیا وہ اس کا اظہار بھی مکمل طور پر کر سکا ہے یا نہیں۔ اس کی حب الوطنی اس کی قومیت اس کے اپنے لوگوں کے عقائد ان کی عملی سرگرمیاں اور اس قسم کی دوسری چیزیں تو خیر سب بعد کی باتیں ہیں۔ کیا معلوم جس چیز کو آپ فی الحال اپنے عقائد اور فلاح و بہبود کے لئے مضر سمجھ رہے ہوں ممکن ہے کل وہی صحیح نکلیں اور سچی ثابت ہوں اور سارا معاشرہ اور ساری قوم غلطی کر رہی ہو۔ اس لئے ایک اچھے معاشرہ میں ادیب کو ذہنی آزادی دی جاتی ہے اس کی بات کو سنا جاتا ہے اور دوسروں تک پہنچنے کی اجازت دی جاتی ہے یہ بات الگ ہے کہ آپ اس کی مخالفت کریں اور اسے اپنے طور پر رد کریں۔

یہاں تک میں لکھ چکا تو مجھے خیال آیا کہ جملہ معترضہ ذرا طویل ہو گیا ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ خیال بھی آیا کہ بورس پیسٹرناک پر کچھ لکھنے کے لئے ان باتوں کا اعادہ کرنا جہاد کا ثواب رکھتا ہے ان باتوں کا اطلاق اس دور میں ہر معاشرہ پر ہو سکتا ہے یہ معاشرہ خواہ ہمارا ہو یا سوویت روس کا ادیب کا بنیادی حق اور تخلیق کے بنیادی محرکات اگر ادیب کے اپنے قبضے میں ہیں تو بے کیفی کا دیو خود شیشے میں اتر جائے اور ادیب پھر سے اپنے کاموں میں لگ جائے۔

انقلاب سے پہلے روسی شاعری مغربی شاعری کی روایت کا ایک حصہ تھی جب اکتوبر کا انقلاب آیا اور زارِ روس کی حکومت کا خاتمہ ہوا تو اس کے فوراً بعد روسی شاعری سے اشاریت پسندی کا زور گھٹنے لگا اور رفتہ رفتہ اس کی جگہ استقبال پسندوں FUTURISTS نے لینی شروع کر دی۔ انقلاب کا نیا جوش تھا شاعر اور ادیب بھی اسی ہنگامے کا ایک حصہ بن گئے استقبال پسندوں نے دعویٰ کیا کہ ان کی شاعری حقیقی انقلابی شاعری ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ لوگ سیاسی شاعری کی

طرف چلے گئے۔ اسی زمانے میں اور بہت سی تحریکوں کا سکہ ادب میں چل رہا تھا ACMEIST اس بات پر زور دے رہے تھے کہ شاعری کے ذریعہ زبان کو مانجھا جائے اور ٹیکنیک اور ہیئت کے ذریعہ اچھی شاعری کی جا سکتی ہے۔ امیجسٹ کہنا تھا کہ اچھی شاعری صرف محض شعری تصاویر کے ذریعے کی جا سکتی ہے۔ انہوں نے بھی اس بات میں اس درجہ غلو برتا کہ ذریعہ کو منزل بنا دیا ان مختلف النوع تحریکوں کے زمانے میں ضرورت اس امر کی تھی کہ ایک شاعر ایسا اُٹھے جو ان سب مختلف دھاگوں کو ملا کر جوڑ دے۔ بورس پیسٹرنک نے ان کی اسی ضرورت کو پورا کرتا ہے وہ نہ تو صرف اشاریت پسندوں کے تصوف کا قائل ہے اور نہ محض ٹیکنیک کا۔ وہ نہ صرف امیجری کو شعر کا ذریعۂ اظہار سمجھتا ہے۔ اور نہ صرف ماضی کی روایت سے اس کا ناطہ جوڑنے کو شاعری تصور کرتا ہے لیکن اگر دیکھا جائے تو یہ سب خصوصیات ایک نئے رنگ و آہنگ کے ساتھ اس کے ہاں ملی جلی نظر آتی ہیں۔

شعر کا ذوق ایک ایسی چیز ہے جو وجدان سے تعلق رکھنے کے باوجود مطالعے ماحول اور بیرونی اثرات سے بھی تیار ہوتا ہے۔ اپنی زبان کی شاعری کو اس ذوق اور وجدان کے ذریعہ سمجھنا اور سراہنا نسبتاً آسان کام ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ لفظوں کے معنی اور مفاہیم ان کی ترتیب خیال کے تیور اور اظہار کا لہجہ ساتھ ساتھ لفظوں کے تہذیبی رشتے ایسی چیزیں ہیں۔ جو شعر پڑھنے والوں کو مجموعی طور پر اپنے گھیرے میں لے لیتی ہیں۔ اور وہ اس پر اپنی پسند نا پسند کی مہر ثبت کر دیتا ہے۔ لیکن کسی دوسری زبان کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت آپ اس کے خیال کو پسند کر سکتے ہیں اس کی تشبیہ کو سراہ سکتے ہیں۔ لیکن اس کا لہجہ اور اس کے داخلی تیور کو آپ اس طور پر نہ سمجھ سکتے ہیں نہ سراہ سکتے ہیں جس طرح اپنی زبان کی شاعری کو سمجھا اور سراہا جا سکتا ہے۔ معمولی معمولی لفظوں میں کیا جادو بھرا ہے اس کی سمجھ صرف اہل زبان ہی کو ہو سکتی ہے۔ باہر والے تو اس کا مطلب و مفہوم سمجھ سکتے ہیں۔ اس کی ہیئت کو دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن وہ داخلی رشتے، اندر کے تیور۔ سادگی میں تیر و نشتر کی کاٹ، زبان کا تہذیبی مزاج اور شاعر کے ذہن میں اس کا اظہار اس وقت تک سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ جب تک اس زبان میں محسوس کرنے کی صلاحیت پیدا نہ کی جا سکے۔ اور کسی زبان میں محسوس کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے

ا

لئے زبان کی تفہیم کے لئے اس زبان کے کلچر اور اندازِ گفتار کی رچاوٹ، لفظوں اور مرکبات کے لہجوں کی پرکھ اور اس کے تیوروں کی پہچان بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ میں نے بورس پیسٹرنک کی شاعری کو اس زمانے میں پڑھا تھا۔ جب اشاریت پسندوں کے مطالعے کا بھوت مجھ پہ سوار تھا۔ اور یہ بات کوئی آٹھ دس سال اُدھر کی ہے۔ اس وقت مجھے یاد ہے کہ اس کی شعری تصاویر اندازِ نظر، تشبیہات، نئے پن۔ لفظوں کو برتنے اور نئے معنی پہنانے کی صلاحیت، منظر کشی میں خارجی رشتوں سے زیادہ داخلی رشتوں کے بیان اور عشقیہ شاعری میں اس کے ذاتی رویے نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ مجھے اس کی شاعری کی فضا میں رہنے کی فضا کا احساس ہوا تھا مجھے یہ بھی احساس ہوا تھا کہ بورس پیسٹرنک کے ہاں ذہنی کیفیات اور ان کیفیات کی بدلتی لہروں میں وہی طریقۂ کار ہے جو مغربی اشاریت پسندوں کے ہاں نظر آتا ہے۔ باآوازِ بلند پڑھنے سے اس کی شاعری میں لفظوں کی جھنکار کا احساس بھی مجھے ہوا تھا۔ میں یہ بات تسلیم کرتا چلوں کہ کسی دوسری زبان کی شاعری کو باآوازِ بلند پڑھے بغیر میں اس وقت تک نہیں سمجھ سکتا۔ جب تک آنکھیں کاغذ کو اور کان آواز کو نہ سن رہے ہوں۔ مجھے پیسٹرنک کے ہاں یہ بھی احساس ہوا تھا کہ وہ دو متضاد چیزوں میں احساس اور اندازِ نظر کا ایک ایسا رشتہ پیدا کر دیتا ہے کہ اُن میں باہم ایک ربط اور ایک آہنگ نظر آنے لگتا ہے۔ اپنے احساس کے پورے اظہار کے لئے وہ ان رشتوں میں ایک ایسا جادو بھر دیتا ہے جسے محسوس تو کیا جا سکتا ہے لیکن جس کا ترجمہ مشکل ہے۔ معلوم نہیں روسی زبان میں یہ بات اس نے کیسے ادا کی ہو گی۔ لیکن انگریزی میں جس کے ذریعہ میں نے پیسٹرنک کو پڑھا ہے۔ (اور ظاہر ہے کہ ترجمہ میں شاعری اپنی اصلیت، مزاج اور لہجے کا بڑا حصہ گنوا دیتی ہے) یہ دو مصرعے یوں نظر آتے ہیں۔

THE MIND IS STIFLED. THE HORIZON IS,
LIKE THOUGHTS. THE COLOUR OF TOBACCO

کہر آلود رات کو دیکھ کر وہ یوں محسوس کرتا ہے۔

LIKE A BLIND PUPPY LAPPING ITS MILK

یا شبنم کو دیکھ کر وہ کہتا ہے۔

RUNS SHIVERING LIKE A HEDGEHOG

یہ مثالیں جو میں نے آپ کے سامنے پیش کی ہیں ان میں احساس کو ایک متضاد چیز سے مشابہ کرکے اس میں ربط کا ایک ایسا رشتہ پیدا کر دیا ہے کہ اس جذبے یا احساس کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ اسی چیز کو اکثر لوگ ابہام کا نام دیتے ہیں۔ ابہام کی وہ قسم تو خاص زیبا کاری ہے۔ جس میں جذبہ احساس یا خیال خود شاعر کے سامنے واضح نہیں ہوتا۔ لیکن اگر ابہام طرز ادا یا اظہار کی وجہ سے پیدا ہوا ہے تو یہ ابہام ایک ایسی چیز ہے جو ہر بڑے کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ اس سے معنی و مفہوم کی وہ تہہ داری پیدا ہو جاتی ہے جو ہومر۔ ورجل، شیکسپیر، سعدی، حافظ اور میر و غالب کے اشعار کو بدلتے زمانے کے شعور کے ساتھ ہم آہنگ کرکے نئی زندگی۔ نئی توانائی اور نیا مفہوم عطا کرتی ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ۔ دیکھئے دور کا [illegible] سے ورلین۔ والیری لارنس کے ہاں بھی ابہام کا یہی طریقہ کار ہے۔ پیسٹرنک کی نظموں کو جب تک باآواز بلند دو تین بار نہ پڑھا جائے ان کا داخلی حسن، لفظوں میں فکر و احساس کا ربط اور شعری تصاویر کا شاعری کے عمل و تاثر سے تعلق واضح نہیں ہوتا۔ یہ ابہام اس کے ہاں شعری تصاویر سے پیدا ہوتا ہے جو ماضی کی دلفریب یادوں۔ موسیقی کی دھنوں، مصوری کے مختلف PATTERNS حقیقی دنیا اور گرد و پیش کے ماحول کے ساتھ مل ملا کر پیدا ہوتی ہیں۔ اس کی شاعری میں یہی شعری تصاویر ایک نیا جادو جگا کر اور [illegible] پیدا کر دیتی ہیں۔ ازرا پاؤنڈ نے کہا تھا کہ اگر آدمی موٹی موٹی کتابیں نہ بھی لکھے۔ اور صرف ایک شعری تصویر ہی تخلیق کر جائے تو بس کافی ہے۔ اس سلسلے میں دو چار مثالیں اور دیکھئے۔

"NIGT LIKE A BARE FOOTED PILGRIM WOMAN" یا

"SPRING THAT GORNFED HUSKY MILKMAID"

یا THE STREET LAMPS ARE JUST LIKE BUTTERFLIES OF GAS

یہ تو میں نے دو ایک مثالیں اپنی بات کی وضاحت کے لئے دیدی ہیں۔ ویسے اس کی بہت سی نظمیں کسی تصویر یا احساس کی پوری تصویر پیش کرتی ہیں۔ جن کا بیان حوالہ

دنیا اور وہ بھی انگریزی میں شاید آپ پسند نہ کریں۔ ڈاکٹر ژواگو کے آخری باب کی نظمیں بھی اس خصوصیت کی حامل ہیں۔ یہ چیز اس کی شاعری کا نقطۂ آغاز بھی ہے اور ذریعۂ اظہار بھی۔ اسی لئے اس کی ذات اور اس کا مزاج اس کی شاعری میں ہر جگہ جھلکتا نظر آتا ہے وہ ان شعری تصاویر کے ذریعہ اپنی ذات اور اپنے احساس کو پُر فریب نہیں بناتا۔ بلکہ اس سے اپنے اظہار کو جامع اور سہل بنانے کی کوشش کرتا ہے شاعر کے ذہن میں سامع کا تصور ہر دم موجود رہتا ہے۔ اگر شاعر صرف اپنے یا اپنے محبوب کے لئے ہی لکھتا تو رابرٹ براؤننگ کی وہ نظمیں جو مسز براؤننگ کے لئے لکھی گئی تھیں بعد میں پڑھنے کے قابل نہ رہتیں۔ لیکن ہم آج بھی ان نظموں کو اسی دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔

پیسٹرناک کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت ایک احساس مجھے یہ بھی ہوا تھا کہ وہ چیزوں کی بجائے ان کے رشتوں اور تاثرات کا بیان کرتا ہے اور اسی وجہ سے اس کی شعری تصاویر اس کے معنی کو وسیع تر کر دیتی ہیں۔ اور پیسٹرناک کی ذات اور اس کا انداز نظر ہر ہر مصرع میں نظر آتا ہے۔ نیچر کے بیان میں وہ منظر کشی نہیں کرتا بلکہ وہ اس میں اپنی ذات اور احساس کا جلوہ دیکھتا ہے۔ اور اس طرح منظر منظر نہیں رہتا۔ بلکہ اس کے احساس یا تجربہ کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ یہی انداز نظر اس کی عشقیہ شاعری میں بھی نظر آتا ہے ہمارے ہاں میر اور مومن ایسے شاعر ہیں جو عشق میں معاملے کے ساتھ پوری کائنات کو سمیٹ لیتے ہیں دشنام یار طبع حزیں پہ اس لئے گراں نہیں گزرتی کہ شاعر کی توجہ دشنام سے ہٹ کر نزاکت آواز پر چلی جاتی ہے یا پھر اس میں اسے شعلہ سا لپکتا محسوس ہونے لگتا ہے۔ پیسٹرناک جب محبوب کا بوسہ لیتا ہے اور یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں) تو اسے بوسہ میں بنفشہ کا ذائقہ محسوس ہوتا ہے اس کا لباس اسے برف کے اس قطرہ کی طرح نظر آتا ہے۔ جو اپریل کو مبارکباد دے رہا ہے۔ موسم بہار اسے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے محبوب نے اپنی زندگی کی کتاب الماری سے اتار لی ہے اور اس کی گرد جھاڑ دی ہے یا اندیل میں کے بوسوں سے جنگل بہتی ہو اور اسے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے علی الصبح کوئی ڈھلوان۔ جب ستارے خاک میں گر پڑتے ہیں اس کے ہاں وہ شاعری بھی جن میں سماج اور انقلاب کے تصورات براہ راست ظاہر ہوئے ہیں اسی رشتے سے ہم آہنگ ہے

INHLL THE WORLD NO SUFFERING ARE

SUCH THAT THEY WILL NOT BE CURED BY SNOW

یہ تھیں وہ چیزیں جن سے بورس پیسٹرنک کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت خاص طور پر متاثر ہوا تھا۔

اس کا آخری مجموعہ کلام ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا اور اس کے بعد یا تو وہ ترجمے کے کام میں لگا رہا یا پھر خاموش رہا۔ ۱۹۳۳ء کے بعد سے روس میں سماجی حقیقت پسندی (SOCIALIST REALISM) کا دور دورہ ہوا۔ اور اس کے بعد سے لطافت احساس روز بروز ادب سے غائب ہونے لگی۔ پائپ لائن فیکٹری۔ مل۔ معدنیات اور قومی حوصلوں کو بلند رکھنے کے لئے ادب کو استعمال کیا گیا اور وہ فن کار جو خدا ہوتا ہے جو تخیل کے زور سے آئندہ زمانے کے احساسات اور خیالات کا خاکہ مرتب کرتا ہے۔ ایک ایسا سوئچ بن کر رہ گیا ہے جس کو دباتے ہی مشین چل پڑتی ہے اور کپڑا بنا جانے لگتا ہے دوا کی گولیاں بننے لگتی ہیں۔ یا پھر کارتوس نکلنے لگتے ہیں۔ لیکن ایسے میں ادب اخبار کا صفحہ بن کر رہ جاتا ہے جسے آپ پڑھ کر دوسرے ہی دن صبح کو آگ سلگا لیتے ہیں۔

اسلوب احمد انصاری

حالی ادبی مجدد کی حیثیت سے

ادبی تجدید کا آغاز کرنے سے پہلے حالی کی شاعری کے تیور کیا تھے اُس کا اندازہ اِن اشعار سے کیجئے

اُس نے اچھا ہی کیا حال نہ پوچھا دل کا   بھڑک اُٹھتا تو یہ شعلہ نہ دبایا جاتا

جو دل پہ گزرتی ہے کیا تجھ کو خبر ناصح   کچھ ہم سے سُنا ہوتا پھر تو نے کہا ہوتا

تھا کچھ نہ کچھ کہ پھانس سی اک دل میں چبھ گئی   مانا کہ اُس کے ہاتھ میں تیر و سناں نہ تھا

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب   بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

رہا ہوں رند بھی اے شیخ پارسا بھی مَیں   مری نگاہ میں ہے رند و پارسا ایک

آیا نہ ہوگا اُس کو تغافل میں کچھ مزا   ذوقِ نگاہ ہم نے جتایا نہیں ہنوز

اک عمر چاہیئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق   رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

بے قراری تھی سب اُمیدِ ملاقات کے ساتھ   اب وہ اگلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں

جی ڈھونڈتا ہے بزمِ طرب میں انھیں مگر
وہ آئیں انجمن میں تو پھر انجمن کہاں

دیدۂ حرم کو تیرے فسانوں نے بھر دیا
اپنے رقیب آپ ہوئے ہم جہان میں

اِن اشعار میں جذبات کرتے ہوئے ہیں۔ آہنگ میں ضبط و اعتدال ہے۔ لہجہ میں دھیما پن اور نرمی ہے، غزل کا محاورہ رچا ہوا ہے۔ اور اِن سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ حالی مروجہ شاعری کے اس میدان میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ لیکن وہ اس روایت سے نا آسودہ رہے۔ اِن کی ہمت اپنے اظہار کے لئے ایک نئی جولانگاہ مانگتی تھی۔ خود حالی کی داخلی زندگی۔ جذبہ کی گرمی۔ رنگارنگی اور توانائی سے شاید خالی تھی اور وہ اصلیت اور واقعیت کے پجاری تھے۔ انسانی جذبات کا دائرہ حسن و عشق کی کیفیات تک محدود نہیں دِل کی دُنیا سے زیادہ حسین اور بھرپور اور بھی دنیائیں ہیں۔ جن کا نظارہ حالی دیکھنا اور دکھانا چاہتے تھے۔

حالی ادبی مجدد اس لئے ہیں کہ انہوں نے پرانے اسالیب کو نئے مقاصد کے لئے استعمال کیا وہ شاعر اور مفکر ہونے کے علاوہ بڑے مصلح ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ قوم کی اصلاح کے طفیل شعر و ادب کی اصلاح خود بخود ہو جائیگی۔ اچھے غزل گو ہونے کے باوجود انہوں نے غزل پر تکیہ نہیں کیا انہوں نے غزل کے خلاف آواز اس لئے اٹھائی کیونکہ اس میں مسلسل خیالات کے اظہار کی گنجائش نہ تھی۔ اس کا ملجا و ماوا چند پا افتادہ موضوعات تھے۔ اس میں تعمیری حسن کا پتہ نہ تھا! ورفن سخن سازی MANNERISM میں تبدیل ہو گیا تھا۔ آزاد کے ساتھ حالی نے نئی قسم کی نظمیں لکھنے کی داغ بیل ڈالی۔ میر۔ میر حسن اور مرزا شوق سے صرف مثنوی کا سانچہ لیا۔ لیکن اسے ایک نیا ضمیر عطا کیا۔ برکھارت" نشاطِ امید" مناظرہ رحم و انصاف اور" حب وطن" جدید اردو شاعری کے خط و خال کو متعین کرتی ہیں۔ یہ نظمیں نیچرل شاعری کے ضمن میں آتی ہیں۔ کیونکہ ان میں منظر نگاری بھی ہے اور عام انسانی جذبات اور معاملات کو بے ساختگی کے ساتھ پیش بھی کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان میں ہندوستانی زندگی اور معاشرت کی بو باس بھی ہے۔ ان میں ادبی پرکاری اور التزام نہیں۔ وہ سادگی اور واقعیت ہے۔ جو بے داغ مشاہدہ اور بے جھجک نظر سے پیدا ہوتی ہے۔ ان میں وجدان اور

تخیل کے کوندے نہیں لپکتے واقعات کسی کیمیاوی عمل سے نہیں گذرتے۔ خیالات اور کیفیات کی ترتیب
تنظیم اور ان کا ارتقا ملتا ہے ان میں سپاٹ اور بے رنگ حصے بھی ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی ان
میں زندگی کا رس ہے مشاہدہ کا فیضان ہے شاعر کے ارد گرد پھیلی ہوئی وسیع کائنات کی پرچھائیاں
ہیں چیزیں اپنے نام رکھتی ہیں۔ اور انہیں محسوس کیا جاسکتا ہے ایسی شاعری کو ہم POETRY OF STATEMENT
کہہ سکتے ہیں۔

یہ نظمیں جن کا ذکر ابھی ہوا۔ اُردو شاعری میں ایک نئی آواز تھیں حالی غزل سے منہ موڑ کر نظم کی
طرف اس لئے متوجہ ہوئے کیونکہ وہ داخلی جذبہ کی شدت اور گہرائی کو شاعری کیلئے ناکافی سمجھتے
تھے وہ انفرادی نفس سے گذر کر اجتماعی زندگی کی نبضوں کو چھونا اور تیز کرنا چاہتے تھے ان کے
سامنے ایک بڑا اور واضح مقصد تھا۔ اور وہ تھا اس قوم کی ذہنی اور روحانی چارہ سازی جو سیاسی بساط
کے اُلٹ جانے کی وجہ سے انتشار بے حسی اور نا اُمیدی کے منجدھار میں گھری ہوئی تھی مثنویوں میں
اُنہوں نے پرانی ڈگر سے ہٹ کر نئی وادیوں میں قدم رکھا۔ لیکن یہ تجربہ چھوٹے پیمانہ پر تھا مسدس میں
اُنہوں نے اس کی توسیع کی۔ اور غزل اور قصیدہ کیخلاف بغاوت کا صاف صاف اعلان کر دیا حالی
ماضی کو حال اور مستقبل کی تشکیلِ نو کیلئے زندہ کرنا چاہتے تھے کیونکہ قومی شعور کا تسلسل اسی طرح
برقرار رکھا جاسکتا ہے۔ مسدس میں اُنہوں نے مسلمانوں کی سطوتِ رفتہ کو آواز دی ان کی تاریخ
روایات اور کارناموں کی یاد تازہ کی۔ تاکہ اس سے ان کے دلوں میں ماضی کی عظمت اور حال
کی پستی اور زبونی کا احساس پیدا ہو۔ اور مسدس کے ضمیمہ میں اُنہیں عمل کے لئے للکارا اور جذبات
کی پراگندگی کو تعمیری صورت دینے کا جتن کیا۔ مسدس بڑی شاعری کا نمونہ نہ ہونے پر بھی بڑی
نظم ہے اس کی ARCHITECTIVENESS اس کے مرکزی تصورات اس کے لہجہ کا اتار چڑھاؤ
اس کی جذباتی منطق۔ اس کی متوازن خطابت اس کا عقلی استدلال اس کے خلوص کی تپش اور اس
کی ہمہ گیر انسان دوستی۔ یہ سب قابلِ غور ہیں۔ اور اس کی عمومیت اس سے ظاہر ہے کہ اس میں جا بجا
قوموں کے مدوجزر کے اسباب کا تجزیہ کیا گیا ہے اس سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ مسدس
لکھ کر حالی نے اُردو میں قومی شاعری کا دروازہ کھول دیا۔ اور یہ ثابت کر دیا کہ شاعری کو اظہارِ
ذات کے علاوہ بڑے مقاصد کیلئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ مسدس اور حالی کی مثنویوں میں ایک اور

(بقیہ صفحہ ۱۷۷ پر)

قرۃ العین حیدر

(زیرِ طبع ناول کے دو باب)

"میں ایک کتاب لکھنے والا ہوں جس کا نام ہوگا: پورٹریٹ آف دی آرٹسٹ ایز اے ڈون ژوان۔" کمال نے منہ لٹکا کر کہا۔

"کیوں کیا ہوا؟" طلعت نے ہمدردی سے پوچھا۔

"بس یونہی۔ جیمز جوائس اور ڈی لن طامس اور اس کے بعد ـــ یہ خاکسار۔ فدوی۔

کل ڈی لن طامس نے بل کے یہاں بڑے مزے کی باتیں کیں ترنگ میں تھے مولانا۔" ہری شنکر نے مڑ کر کہا۔

"اجی وہ تو تھے۔ آپ کہیں ترنگ میں ہیں آج کل۔" گلشن اہوجہ نے کمال سے پوچھا "کیا پڑھ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں یار خط آیا ہے ـ گھر سے ـــ یعنی لکھنؤ سے۔"

"کیا خبریں ہیں؟" طلعت نے پوچھا۔

وہ سب سُریکھا کے ڈرائنگ روم میں فرش پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھے تھے۔ کمرے کا بڑا دروازہ باغ میں کھلتا تھا۔ بہار کا روشن دن تھا۔ سریکھا دہلیز کے پاس بیٹھی مشین پر لہنگے کی آڑی گوٹ ٹانک رہی تھی۔ طلعت اور فیروزہ باورچی خانے میں کھانے پکانے میں مصروف تھیں۔ ہری شنکر بھی ان دنوں وہیں موجود تھا۔ جو واشنگٹن سے آیا ہوا تھا۔ اور قاہرہ جا رہا تھا۔ "یہ ہری شنکر اور گوتم کے مزے ہیں ـــ بالکل ابن بطوطہ بنے ہوئے ہیں۔ آج کل۔ صبح صبح گوتم کا فون آیا تھا کہ پھر ماسکو جا رہا ہے۔" گلشن نے کہا۔

"گوتم تو ہیون سانگ بھی ہے۔" کمال نے کہا۔ "اکثر چین سے آیا کرتا ہے۔"

باغ میں چندرا ماتھر نے ایک اور گیت شروع کر دیا۔ ان سب کی پرانی دوست چندرا جو نیویارک سے دلی واپس جاتے ہوئے زرینہ کے یہاں لندن میں ٹھہر گئی تھی۔ بہت اچھا گاتی تھی ڈرائنگ روم کے دوسرے سرے پر طغیان صاحب سُریکھا کے شوہر گلشن اہوجہ کے ساتھ مصروف گفتگو تھے۔

بڑا خوش گوار اور پرسکون اتوار کا دن تھا۔ باغوں میں پھولوں کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ صبح

صبح جب چمپا جوُن کا رٹر کے گھر سے سُر نجیا کے یہاں آنے کیلئے بس میں سوار ہوئی تھی تو بس کا بوڑھا کنڈکٹر اُسے دیکھ کر خوش دلی سے مسکرایا تھا۔ اور اُس نے اپنی ٹوپی چھوتے ہوئے کہا تھا۔ "مائی ڈیر تم بیحد خوبصورت لگ رہی ہو۔ تمہارا بوائے فرینڈ تمہیں دیکھ کر بہت مسرور ہو گا۔ خوب خوشی سے اتوار مناؤ"۔ دُنیا بڑی مہربان تھی اور خوش گوار کون کہتا ہے کہ دُنیا غم خانہ ہے اور فلانا اور ڈھماکا ہے۔ دُنیا تو بیحد آرام دہ حسین جگہ ہے۔

وہ بیحد خوش تھی۔ کل اُس نے گوتم سے فون پر باتیں کی تھیں۔ اتنے برسوں بعد آج اس کی آواز سُنی تھی۔

وہ سُر نجیا کے یہاں پہنچی۔ یہاں محفل جمع تھی وہ بیحد مسرت کے ساتھ سب سے باتیں کرتی رہی۔

رات کو پارٹی میں بوٹ پر بڑا جنڈ و خانہ رہا۔ کمال نے اُس سے کہا "آپ کیسے بجے تک گھر پہنچ گئی تھیں۔؟ ہم جب لوٹے تو ٹرینیں بند ہو چکی تھیں۔ اسٹرینڈ سے گھر تک پیدل آئے"

"کیا خبر یہ بھی کس کا خط ہے"۔ طلعت نے باورچی خانے میں سے سر نکال کر دوبارہ پوچھا۔

"آپی کا"۔ کمال نے جواب دیا۔

"میاں ہری شنکر۔ لے بھائی ہری شنکر ہوت"۔ طلعت نے باورچی خانے میں سے آواز دی۔ "ہری شنکر جو باغ کے دروازے میں کھڑا تھا۔ پلٹ کر اندر آیا"۔ لو یہ گرم گرم پوریاں۔ چمپا باجی کدھر ہیں۔ یہ پلیٹ اُن کو دے آؤ"۔

"ویہی گلفشاں" کا سخت گھریلو ماحول یہاں بھی موجود تھا۔ گھر۔ جو اس سے کبھی بہتر نہ ہو گا۔ چمپا کو دریچے کی نشست میں بیٹھے بیٹھے ایک جھرجھری سی آئی۔

ہری شنکر نے پلیٹ ہاتھ میں لیکر کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ چمپا دوسرے کمرے میں دریچے میں بیٹھی تھی۔ اُسے دیکھ کر وہ سب یاد آتا تھا۔ مگار خاتون کی زندگی۔ فران

کے پتے۔ دریچے میں جھانکتا ہوا پیرس کا مدھم سورج۔ یہ ہیپیا۔ برآمدے میں رکھی ہوئی جدید وضع کی آرام کرسیاں۔ دھاری دار سن شیڈ۔ ایک کاہل الوجود ذہنی زندگی جس میں فلسفے تھے۔ اور نیا فرانسیسی ادب۔ بڑے سائز کے سمفنی کے ریکارڈ۔ سالز برگ کے موسیقی کے تہوار۔ یونیورسٹی کے کواڈرینگل۔ اور جانے کیا کیا۔ اسی قسم کی چیزیں جن کی ایک علیحدہ دنیا نیویارک کے گرینچ ویلیج۔ دریائے سین کے بائیں ساحل اور یہاں لندن کے چیلسی اور سینٹ جانز وڈ میں آباد تھی۔ اس دنیا کے باسیوں کے یہاں بڑے گہرے جذباتی تجربے تھے۔ اور ادراک اور ماورائی قسم کی گفتگو۔ چمپا باجی تم تو بہت جلد ایک دوسرے سرے پر پہنچ گئیں۔ پتہ نہیں اب تم کمل کرشنی بھی ہو یا نہیں۔ اندرونی توازن تم نے قائم رکھا یا نہیں۔ جس کی تم کو ہمیشہ بڑی تلاش رہی۔ اب سب دیکھا۔ طلعت۔ فیروز۔ ان لڑکیوں ہی کو دیکھ لو۔ کیسی سمجھدار ہیں ایک سے ایک۔ لڑکیوں کا معاملہ دراصل ہے تو ایڈجسٹمنٹ سے۔ ایک دفعہ میں بیاہ پار لگ گئی تو لگ گئی۔ ورنہ بیڑا ہوا۔ ہم تو صاحب جانتے ہیں۔" چمپا باجی تو لیوبالی کیما اس نے با آواز بلند کہا۔

چمپا کے قریب جا کر وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ جس طرح سنگھاڑے والی کوٹھی کے لان پر وہ اس کی کرسی کے قریب بیٹھا کرتا تھا۔

"ان سب کو کیا ہو گیا۔ سب کے سب ہو گئے ایک دم؟" لقمان صاحب جو باتیں کرتے کرتے رک کر گلشن سے سرگوشی میں پوچھا۔

"ان سب کے خیالات سوار ہیں۔" گلشن نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"بڑا پر مدت ہے" لقمان صاحب نے کہا۔ "شرمیلا دیوی کیسے سینا بھی جاتی ہیں۔ مجھے گمان نہ تھا۔ کمال ہے۔ پوریاں کھا رہے ہیں۔ چنڈا دادی پھلواری میں مرغیاں ہانک رہی ہیں۔ طلعت جی پھلکیاں تل رہی ہیں۔ یہ تو بالکل گرودیو ٹیگور کے ناولوں جیسا ماحول ہے کیسا کون شاعرانہ۔ مدھر۔"

"اجی دیکھے مجھے ٹیگور کے ناول" گلشن نے چڑ کر کہا۔ "لاحول۔ تم نے ساری عمر بیان دیں اکٹھا کر۔ جاؤ بھجوا دو۔"

طغیان صاحب پھر مراقبے میں چلے گئے۔

"ہلو۔ ہری شنکر۔" چمپا نے اخبار پڑھتے پڑھتے سر اُٹھا کر کہا۔ "کیا بات ہے۔

اب پوچھتی ہیں کیا بات ہے۔ قسم خدا کی ان کی دھاندلی کی حد نہیں۔" "کچھ بھی تو نہیں

چمپا باجی۔ چائے پئیں گی ۔؟"

"بنا دو۔"

اس نے پیالی اٹھائی۔ چمچہ نیچے گر گیا۔

ہم ایک دوسرے کی زندگی میں گھسے زندہ ہیں اور مستقل ایک دوسرے کو مارتے جلاتے

رہتے ہیں۔" چمپا باجی۔" ہری شنکر نے کہا۔ "تم ہم سب میں گریٹ ہو۔ کیونکہ تم میں محبت کی

انتہا۔ بے پناہ اہلیت موجود ہے۔" اس نے دفعتہً آہستہ سے کہا۔ "سنو۔ یو این میں ایک بڑی

اچھی جگہ نکلی ہے۔ انڈیا کے کوٹے میں۔ اس کیلئے کہو دوں کوشش تمہارے لئے؟"

"کیا مطلب ہے تمہارا۔ میں عمر کسی طرح ماری ماری پھروں گی ۔؟"

"اس کے علاوہ اور کرنا بھی کیا ہے تمہیں۔" ہری شنکر نے کہا۔ پھر معاً اسے اپنی اس

فاش غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے کسی چھوٹی موٹی اینٹ کی بجائے پورا پہاڑ لڑھکا دیا تھا

مگر یہ تو بڑی بہادر فراخ دل آدمی ہیں۔ اس کا کیا بُرا مانیں گی۔ "میرا مطلب ہے"۔ اس نے بڑبڑا

کر بات بنائی۔ "کہ تم میں اتنی خود اعتمادی ہے۔ تم اوروں کی طرح تھوڑا ہی ہو کہ کہیں چولہا

ہنڈیا لے کر بیٹھ جاؤ۔" اس نے باورچی خانے میں گھسی لڑکیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "

اجی میں تو کہتا ہوں کہ تم تو ایورسٹ تک چڑھ جاؤ گی مزے سے دندناتی ہوئی۔" "تم بڑی

گریٹ ہو چمپا باجی ۔!۔" اس کی آواز میں رقت آگئی۔ اسے چمپا پر یکلخت بے حد ترس

آرہا تھا۔ وہ خاموش بیٹھی باغ کو دیکھا کی۔

کمرے کے دوسرے سرے پر اب باتیں پھر زور شور سے شروع ہو چکی تھیں۔ چمپا کو یکلخت

ایسا لگا۔ جیسے خاتمہ بالآخر آن پہنچا۔ کمرہ بڑے زور سے ناچنے لگا۔ باغ میں گھومتی جو

اسے قندیل کی طرح چکر کاٹتی نظر آئی۔ کمرے میں بیٹھے لوگ گٹھ پتلیوں کی طرح عجیب

عجیب آوازیں نکال رہے تھے۔ طغیان صاحب اسے ایک بہت عظیم مطلع نظر آئے جو بیچھے

شروں میں قائم کر رہی تھی۔ میں دیوانی ہو جاؤں گی۔ اس نے آہستہ سے کہا اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے
ہری شنکر نے اس کی آنکھوں میں آنسو پہلے کبھی نہ دیکھے تھے۔ اس وقت بھی نہیں جب تقسیم ہند کا اعلان سننے کے
بعد وہ سب لکھنؤ میں پروفیسر بنرجی کے یہاں دھاڑیں مار مار کر روئے تھے۔

”چمپا باجی۔“ اس نے کہا۔ ”محبت کو خدا را جذباتیت میں تبدیل نہ کرو۔ توازن
ضبط۔ تناسب۔ کلاسکل۔ گریک آئیڈیلز اصلی چیزیں ہیں۔ یعنی کہ۔“

”کیا معماروں کی سی باتیں کرتے ہو۔“ چمپا کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ ”میں محبت کر
رہی ہوں یا کوئی عمارت کا نقشہ تیار کرنے میں مصروف ہوں۔“

”چمپا باجی“۔ ہری شنکر نے اس طرح احتجاجاً کہا۔ ”تمہارے خیالات گوتھک ہیں
ہمیشہ سے تھے۔ تمہارے جذبات میں واگنر کا بوجھ ہے۔ پہلے بھی تھا اب زیادہ ہو گیا ہے
قصہ مختصر یہ کہ تم اپنی روح کی پیوریٹی کو تباہ کیے ڈال رہی ہو۔ دس سال گذر گئے مگر
تم نہ بدلیں۔“

جون اور اوجیت پارٹی کی تاریخ لے کر اندر آئے اور کمال کی طرف چلے گئے۔

”ہری شنکر۔“ چمپا نے جھک کر کہا۔ ”مجھ پر ترس نہ کھاؤ۔ مجھے شکست کا احساس
آج تک نہیں ہوا۔ میں تو یہ جاننا چاہتی ہوں کہ شکست کیسی ہوتی ہے۔“

ڈائننگ ٹیبل پر سے طغیان صاحب کی آواز بلند ہوئی۔ ”ہم سب سائے ہیں سائے“
وہ گلشن سے کہہ رہے تھے۔

”جی ہاں درست ہے“ گلشن نے بور ہو کر سگریٹ جلایا اور چمپا کی طرف بے دھیانی
سے دیکھنے لگا۔

”کمیونسٹوں نے مارکسزم کو تباہ کر دیا۔“ طغیان صاحب نے جون کارٹر پر نظر ڈال
کر دوسرا موضوع شروع کیا۔

موصوف بڑے زبردست سوشلسٹ تھے۔ صوفی ازم ان کی سائیڈ لائن تھی۔ انہوں نے
ہندی میں بہت سے ناول لکھ ڈالے تھے۔ اب انگریزی میں لکھنے کا ارادہ کر رہے تھے ان کا
پورا نام رائے ہربنس رائے طغیان بھاگل پوری تھا۔ بہار کے رہنے والے تھے۔

"میرے حضرت نے مجھ سے فرمایا"۔ انہوں نے کہنا شروع کیا
"ان کے ایک مسلمان گرو ہیں جو سرینگر میں رہتے ہیں"۔ ہری شنکر نے چپکے
چپکے چمپا کو بتلایا۔
"میرے حضرت نے مجھ سے کہا۔ بچہ تو روس جا۔" "اور ان ملعون ملحدوں کو
سوشلزم کی مشعل ہدایت دکھلا کر راہِ راست پہ لا۔" طلعت نے باورچی خانے میں سے
دیا۔ "انہوں نے بھی اپنے حضرت کو بھی اچھا سدھایا۔" چندرا نے باغ کے دروازے
آکر کہا۔
طفیان صاحب نے چونک کر اسے دیکھا۔
"یہ کون مہیلا ہیں ۔ ؟" انہوں نے سُریکھا سے دریافت کیا۔
"یہ مہیلا بھی بڑے پہ وگریسو چاروں کی مالک ہیں لیکن ڈالر کمانے کی اُدھیش
نیویارک کی آکاش بانی سے ہندی میں سماچار سُنایا کرتی ہیں۔ اِن کا وان کل ہی
پہنچا ہے۔" کمال نے جواب دیا۔ "آپ بہار کے رہنے والے ہیں ۔ ؟" چندرا نے شگفتگی
پوچھا۔ "جی ہاں"۔ طفیان صاحب نے خفا ہو کر کہا۔ "ہوں تو سہی۔ پھر۔ ؟"
"ارے میرا مطلب تھا۔ تب تو آپ شاید گوتم نیلمبر کو جانتے ہوں۔ اس نے پٹنہ
میں پڑھا ہے۔"
"جانتا ہوں۔ بیوقوف لڑکا ہے۔" طفیان صاحب نے مختصراً کہا۔ "ہاں تو کہہ
رہا تھا۔ کہ ہم سب آئے ہیں۔ میں بھی۔ تم بھی۔ گوتم نیلمبر بھی تمہارا میرے حضرت نے کہا
کمال۔" طلعت نے تیلیاں چولھے سے اتار کر پوچھا "اپ نے کیا لکھا ہے خ
"ارے ہاں"۔ کمال نے اداجیت سے باتیں کرتے ہوئے مڑ کر کہا۔ "کچھ نہیں۔
صاحب کی شادی ہو گئی ۔"
"ہائیں ۔ وہ کب"۔ ؟ کورس ہوا۔ ہر ایک اپنی جگہ سے اُچھل پڑا۔
"اتنی بڑی بات ہو گئی اور تم چپ چپ کا لڈو بنے بیٹھے ہو"۔ طلعت نے سینے
ہاتھ رکھ کر کہا۔ "ایسی کون بڑی بات ہو گئی بھئی ہم سب آئے ہیں۔" کمال نے اطمینان

کہا: ابھی تم نے سنا ہے طغیان صاحب کے حضرت کیا کہتے ہیں

"تم بکواس مت کرو" ہری شنکر نے چھلانگ کر کمرے کے وسط میں آتے ہوئے کہا "تفصیل سے واقعہ بتاؤ کیا لکھا ہے اپی نے"

"یار ہوا یہ کہ"

"شروع سے شروع کرو" طلعت نے حکم دیا۔

"خوب نمک مرچ لگا کر سناؤ ورنہ لڑکیوں کو چین نہیں آئے گا" گلشن نے حسب معمول اپنے CYNICAL انداز میں کہا۔ سب کمال کے چاروں اور آن بیٹھے اور کان کھڑے کر کے قصہ سننے لگے۔ کمال نے ماہر فن داستان گو کی طرح سگریٹ مٹھی میں لے کر لمبا کش لگایا۔ چمپا دریچے میں بیٹھی ان سب کو دیکھتی رہی۔

"بھیائیو اور بہنو — تم کو معلوم ہی ہے — کہ بھیا صاحب بے چارے بڑے زبردست سوشل کلائمبر" "یہ کیسے لکھنؤیں تو نہیں تھے" فیروز نے اعتراض کیا۔

"تم اپنا لکھنؤ لیے پھرتی ہو بات بے بات۔ بھیا صاحب پاکستانی ہیں اور دہلی کی ولیبوز —" "پھر سیاست شروع ہو گئی" گلشن نے کہا "یہ تم تو اپنے بھیا جی کا قصہ سنانے لگے تھے"

"سنانے لگے تھے نہیں یار سنانے والے تھے۔ تم پنجابی اودبدا کر غلط اردو بولتے ہو۔" ہری شنکر نے ناک بھوں چڑھا کر کہا "ارے جا۔ یو پی کے بنیے —" گلشن نے جواب دیا۔ "لاؤ بھئی۔ اپی کا خط دو۔ ہم لوگ باہر جا کر خود پڑھ لیں" فیروز نے تنگ آکر کہا: تم لوگوں کی لونڈہار پارٹی کبھی سنجیدہ ہونا جانتی ہی نہیں۔ ہونہہ —"

"ہاں تو ہوا یہ کہ بھیا صاحب سوشل کلائمبر — جب روشن کراچی واپس گئی ہے اُس سے بہت پہلے ہی اُن کو معلوم ہو چکا تھا کہ بچاری کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اب شاہرخ سلطانہ منظر پر آئیں مگر کراچی میں حکومت تبدیل ہو گئی۔

"اس اس کا کیا مطلب" جو بات کی بے تکی —" ہری شنکر نے کہا۔

"ارے اس کا مطلب ہے کہ کزن شاہ رخ کے ابا منسٹر نہیں رہے"

"اوہ۔"

"اب لکھنؤ سے ہماری والدہ یعنی بھیا صاحب کی چچی کے خط پہ خط آنے شروع ہوئے کہ میرا چل چلاؤ کا وقت ہے۔ یہاں تم گھر بسا لو۔ ایک ایک کر کے گلفشاں سے بچھی اڑ گئے کم از کم تم یہاں آکر بہو کا ڈولا ہی لے جاؤ۔ طلعت ذرا چاء بنانا۔"

چاء کا دور چلا۔ کمال نے سانس لے کر پھر داستان شروع کی۔ "تو بھائیو اب سچوئیشن یہ ہے کہ سارے مسلمان بیچلرز پاکستان میں ہیں اور لڑکیاں انڈیا میں۔ تو لڑکیاں وہاں سے جہیز بنا بنا کر پاکستان لاتی ہیں۔ اور وہاں انکی شادیاں ہوتی ہیں یا بیچلر لوگ چھٹی لے کر انڈیا جاتے ہیں اور وہاں سے دلہن بیاہ لاتے ہیں۔ انڈیا آج کل بڑی تعداد میں علاوہ علیگڈھ کے گریجویٹوں کے مسلمان لڑکیاں، پاکستان ایکسپورٹ کر رہا ہے۔ تو بھائی ہمارے بھیا صاحب نے بھی ان کے خطوط سے متاثر ہو کر چھٹی لی۔ اور ایسا سپاٹا مارا کہ لندن سے پہنچے لکھنؤ سیدھے۔ اپی نے لکھا ہے کہ گلفشاں میں بڑے گلے شکوے ہوئے۔ بھیا صاحب امی کے گلے لگے۔ گنگا دین سے چمٹ کر ملے۔ وغیرہ وغیرہ۔ بڑا ڈریامہ رہا۔ نئے سننے والوں کی خدمت میں عرض ہے۔" اس نے سر کھجایا۔ چندرا اور نرگیش کی طرف مڑ کر اضافہ کیا۔ "کہ میری بڑی بہن جن کا یہ خط ہے۔ بھیا صاحب کی بچپن کی منگیتر ہیں۔ اور بھیا صاحب نے اُن سے بیاہ نہیں کیا تھا۔ یا انہوں نے بھیا صاحب سے بیاہ نہیں کیا تھا۔ بہرحال اس کا بھی بڑا زبردست ڈریامہ رہا تھا! اپی کی شادی کافی عرصہ ہوا ایک صالح نوجوان سے ہو چکی ہے جو یوپی گورنمنٹ کے محکمہ زراعت کا افسر ہے۔ اور اپی معقول شخص سے اپنے گھر میں خوش ہیں تو اب بھیا صاحب نے الٹی میٹم دے دیا ہے کہ وہ صرف چند ہفتے کی رخصت پر آئے ہیں۔ انڈیا پاکستان کا معاملہ۔ بہت مشکل سے چھٹی منظور ہوئی ہے۔ لہٰذا جلد از جلد ان کے لئے لڑکی تلاش کی جائے۔ اور ظاہر ہے کہ لڑکی بڑے آدمی کی درکار تھی۔ کیونکہ آپ جانو ہم لوگوں کا خاندان بھی بہت بڑے آدمیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اللہ کے فضل سے۔"

"آپ لوگ لکھنؤ کے نواب ہیں۔؟" طفیان صاحب نے گردن بڑھا کر بیحد دلچسپی سے عینک کے پیچھے آنکھیں جھپکاتے ہوئے پوچھا۔ ان کو اپنے نئے ناول کا پلاٹ سجھائی

دے گیا تھا۔

"جی ہاں ہیں۔" کمال نے مختصراً جواب دے کر بات جاری رکھی۔" انکی وہ منہ بولی بہن یاد ہے۔" ہری شنکر کو مخاطب کیا۔" وہ پہاڑی لڑکی یونیورسٹی والی۔"

" ہاں ہاں کہے جاؤ۔ وہی سیتا ڈکشٹ۔" ہری شنکر نے سر ہلایا۔

"ہاں وہ چیپٹی سی ناک والی۔ گوری سی۔ موٹی سی لونڈیا۔ وہ جو راکھی باندھ کر اِن کی بہن بنی تھی۔ ایک خوبصورت جناب وہ سارے یراں کیلئے رشتے ڈھونڈتی پھرتی۔ کوئی موٹی آسامی ہاتھ آئے۔ کوئی موٹی آسامی ہاتھ آئے۔ اِس معاملے میں بھی بھیا صاحب اپنے حساب خوش قسمت ہیں یہ ہے۔ سر فلاں کو جانتے ہو۔ نام نہیں لوں گا۔"

" وہی جن کی ایک لڑکی ایک مرتبہ۔" ہری شنکر نے منقار کھولی ہی تھی کہ کمال نے جلدی سے بات کاٹی۔" ہاں ہاں۔ وہی۔ بس اے جناب سیتا فوراً ٹکٹ کٹا کر مسوری پہنچی۔ جہاں سر فلاں کا خاندان موجود تھا اور جب دیکھو تب سولائے میں موجود۔ بھیا صاحب کی تعریفوں میں زمین آسمان ایک کر کے رکھ دیا۔ اِس نے بگڑو لونڈیوں کے دماغ اتنے چھوٹے ہوتے ہیں۔ آپ نے لکھا ہے جب ایسی ایسی تعریفیں کرے سیتا تو اس دوسری لونڈیا نے جل کر کہا کر لیجے ہر آپ کے چہیتے بھیا صاحب تو آپ خود اِن سے بیاہ کیوں نہیں کرتیں۔ اِس پر سیتا بہت روئی اور بھیا صاحب کو اس نے لکھ دیا کہ میں اس معاملے سے ہاتھ دھوتی ہوں تم خود آن کر لڑکی دیکھ جاؤ۔ بھیا صاحب ترنت ہی مسوری پہنچے۔ لونڈیا کی ماں نے کہا۔ ہمارے ہاں پاکستان سے ایک بڑھیا پیغام آئے ہوئے ہیں۔" خیر اِس طرح کے نخرے تو لڑکی والے کرتے ہی ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ بات طے ہو گئی۔ سیتا جھٹ پٹ بری خریدنے دلی پہنچی۔ بھیا صاحب نے اس سے کہا۔ میری سگی بہن کوئی نہیں۔ دو چچا زاد بہنیں تھیں دونوں گھر پر موجود نہیں۔ طلعت ولایت میں ہے تہمینہ اپنی سسرال میں ہیں۔ اب تم ہی سارا انتظام کرو شادی کا۔ چنانچہ صاحب تاریخ طے ہو گئی۔ مگر یار ہری شنکر۔"

"ہاں یار کمال۔"

بھیا صاحب کا وہ زمانہ یاد ہے ۳۹ء والا۔ جب ہم تم اُن کے اسٹوج بنے پھرا کرتے

تھے جو لوگ اس دھوم دھام سے آ بیٹھتے ہیں۔ اس کا انجام کتنا پھسپھسا ہوتا ہے۔"
سیتیا کا کیا قصہ ہے یار۔"

"کچھ بھی نہیں یار۔ طلعت۔ چاء منگائیے"

چاء کا دوسرا دور چلا۔ سب تازہ دم ہوئے۔ چمپا اس اثنا میں اٹھ کر باہر باغ
جا چکی تھی۔

"یار اس سیتیا ڈکنشٹ پر روشنی ڈالو" ہری شنکر نے پھر مطالبہ کیا۔ "میں یہ نام
بالکل بھول چکا ہوں۔"

"ارے میاں وہ چمپا باجی کی کلاس فیلو تو تھی۔ ان کے ساتھ بعد میں چاند باغ دا
کالج میں رہا کرتی تھی۔ اور بڑی صاف تھی۔ آئی ٹی میں۔ چمپا باجی کے واقعے کے بعد بھیا صا
سکونِ دل کی خاطر اسے بہن بنایا۔ راکھی واکھی باندھ کر باقاعدہ اور جناب بات تو یہ
وہ اپنے دل سے انکی بہن۔ یہ چیز میں ہندو لونڈیوں کی مانتا ہوں۔ بہن بنتی ہیں تو صدق
سے یہ رشتہ مانتی ہیں۔ لیکن اس کے برعکس ہمارے یہاں زیادہ تر مسلمان لڑکیوں کی اند
سائیکولوجی یہ ہے کہ۔۔"

"ارے چھوڑو یار مسلمان لڑکیوں کی سائیکولوجی۔ اچھا تو بھیا صاحب نے سکون
کی خاطر۔"

"ہاں اصل میں ان کی سائیکولوجی یہ تھی۔"

"اس سے ہم سب واقف ہیں۔ تم آگے چلو۔"

"بات تو پوری کرنے دو۔ بیچ میں بولے چلا جاتا ہے نامعقول۔ تو بھیا صاحب
تھا کہ جب تک تین چار لونڈیاں دور نزدیک سے انکی پرستش میں نہ جٹی رہیں۔ انکی زندگی
نامکمل دکھلائی دیتی تھی۔ اس قدر عادی ہو گئے تھے وہ اس کے۔ دراصل ان کو ان کے
لونڈیوں نے مارا۔ میں بتائے دیتا ہوں۔ نہ آئے ہوتے بھیا صاحب سوئزر لینڈ سے پتلون دو
کندھے اچکاتے نہ لونڈیوں کا بیڑا ہوتا۔ مگر خیر دوست وقت کی بات ہوتی ہے
یوں سمجھ لو کہ سیتیا ڈکنشٹ کے بھی بڑے گھر سے نفسیاتی نکلتے تھے۔۔۔۔"

"اہیں۔ ؟ تم تو کہہ رہے تھے کہ ہندو لونڈیاں دل سے بھائی سمجھتی ہیں۔" گلشن
کہا۔"

"یہی تو لاشعور کا ایک اہم نکتہ ہے۔ سیتا کے لاشعور میں یہ پنہاں تھا۔"

کمال ڈر دن کرتا رہا۔ چمپا باغ میں ٹہلتی ہوئی کمرے کے پاس سے گذری۔ کمال کی
آتی رہی۔ "یہ نکتہ پنہاں تھا کہ سیتا میں احساسِ ملکیت بہت شدید تھا۔ سب لونڈیاں یہ
پنہاں ہوتا ہے۔ شعوری طور پر چاہتی تو وہ یہ تھی کہ بھیا صاحب بیاہ کریں وہ ننند
ور قاعدے کے موافق اِن کے سر پر دوپٹہ ڈال کر برات لے جائے۔ مگر تحت الشعور
یہ خواہش تھی کہ بھیا صاحب کی شادی نہ ہو۔"

"یہ سب بصیرت افروز باتیں آپی نے لکھی ہیں۔ ؟ فیروز نے اداس ہو کر پوچھا۔
وہ نہیں یہ اِس نیاز مند کی ریڈنگ ہے۔ چنانچہ جناب اُس نے جو لڑکی تجویز دی گئی
کو کھٹ دیتی سے ناپسند کر دیا۔ اور بھیا صاحب اُس کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے
ہے۔ بلکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ چمپا باجی کی طرف سے دل اُٹھی   سیتا ڈکشٹ نے رُلایا
دیا تھا۔ بھیا صاحب کا لکھنؤ ہیں۔ گو چمپا باجی خود آخر میں کونسی گھاس ڈالے دے رہی
ہیں۔ بھیا صاحب کے آگے۔ مگر گوئیاں کی حیثیت سے اِس کا فرض تھا۔ کہ ... مگر ہیں۔
یا سٹڈی کیا ہے بھائی" گلشن کہ لونڈیاں جہاں کسی لونڈے کا معاملہ آیا سارا
یا بھول جاتی ہیں۔ خیر صاحب تو آپی رقم طراز ہیں کہ پچھلے اتوار کو نکاح ہوا۔ نئی دلہن
لے نینی تال گئے ہیں۔ بھیا صاحب اگلے مہینے لندن واپس جائیں گے۔ بہو کو لے کے"
یار سنا ہے شانتا بھی ان میں کھٹ پٹ رہنے لگی ہے۔" طلعت نے چہک کے اطلاع

دل چھوڑنے والا ہے اُسے۔"

"زیادہ تر انٹلکچوئیل   لوگ اپنی بیویوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اگر وہ خود بھی انٹلکچوئیل
تی ہیں۔" کمال نے لاپرواہی سے کہا۔ "تم لوگ تو یار لندن کی ایک انسائیکلو پیڈیا
کیند لیکا مرتب کر ڈالو۔ ریفرنس کے لیے آسانی رہے گی۔"

"روشن کی بھی سنا ہے کراچی شادی ہو گئی کسی اعلیٰ افسر سے۔" طلعت نے کہا مبارک ہو"

کمال نے جواب دیا۔

"بیچاری چپلی گئی۔ واپس اپنے خول میں۔" فیروز بولی "بے کار اس نے یہ سارا جھنجھٹ کیا۔"

"یہ لڑکیاں عشق کیوں اور کیسے کرتی ہیں۔ آج تک میرے پلے نہ پڑا۔" طلعت نے کہا۔ "ارے یار خدا کے لئے آہستہ بولو۔ وہ ٹہل رہی ہیں سامنے باغ میں۔" کمال نے کہا۔ "ہماری نگریاں میں آئے بسو بنواری۔" طلعت نے لوفروں کی طرح گانا شروع کیا۔ لڑکیاں اٹھ کر ایک کونے میں چلی گئیں۔

"آج کل ان کا کیا سلسلہ ہے۔" سُریکھا نے چپکے سے پوچھا۔

"میاؤں۔ میاؤں۔" کمال نے دور سے چڑایا۔

"یار وہ سَرِل ایشلے تو کل میں نے دیکھا۔ سیلا مکرجی کے یہاں ڈٹا ہوا تھا۔ کیا وہ بھی سکونِ دل کی خاطر۔" طلعت نے پوچھا۔

"واہ۔ عین مین معلوم ہو رہا ہے مسلم اسکول لکھنؤ کی سیکنڈ ائیر میں پڑھنے والی لڑکیاں گفتگو کر رہی ہیں۔" کمال نے کہا۔ سُریکھا اور طلعت اور نرگس ان سنی کر کے کھُس پھُس کرتی رہیں۔

"یہ لوگ کتنی ہی افلاطون کیوں نہ بن جائیں۔ رہیں گی وہی کشمیری محلہ گرلز اسکول لکھنؤ۔" کمال نے دوبارہ کہا۔

"سوال یہ ہے۔" فیروز نے فرش پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "مڈل کلاس لڑکیاں اتنی رومان پرست کیوں ہوتی تھیں۔"

"ہوتی تھیں کیا معنی۔ اب بھی ہیں۔ تم تو اس طرح کہہ رہی ہو گویا یہ پوسٹ ریوولیوشن پیریڈ ہے اور ماضی پر خالص مورخانہ انداز سے بحث کر رہے ہیں ہم۔" طلعت نے کہا۔ "مگر صاحب رومن میں ممکنات تھیں۔ وہ برلین والا قصہ یاد ہے۔ کیا کیا ہم نے اس کو رد کیا ہے۔ جب ہم لوگ بخارسٹ جا رہے تھے تو بیٹھی ہمارے ساتھ آسٹریا کی سرحد تک گئی۔ وہ تو نکل چلتی ہمارے ساتھ مگر۔" فیروز بولی۔ "مگر کیا یار۔

ڈرپوک تھی۔ پچانوے فیصدی بورژوا لڑکیوں کی طرح۔ بس ہر وہاں دماغ میں ٹھنسا تھا۔ ولے رومانس، ولے بورژوا فلسفہ۔ لال جھنڈے والا مجھے اس سے کوئی ہمدردی نہیں۔ یعنی عشق بھی کیا تو کس سے۔ بھیّا صاحب جیسے بوگس انسان سے"۔ طلعت نے کہا "اب وہ اس اعلیٰ افسر کی بیوی بن کر کراچی جم خانہ کی پارٹیوں میں زندگی گذارے گی۔ اسپنوزا کے بعد کیا ڈاؤن فال ہوا ہے"۔ سُریکھا نے کہا۔ "تمہارا تخیل اس وقت زوروں پر ہے"۔ طلعت نے کہا۔

"میرے تخیل نے ہم سب کو عجیب عجیب حالتوں میں دیکھا ہے"۔ سُریکھا نے اُداسی سے کہا۔ "مَیں نے دیکھا ہے کہ چمپا بیگم ایک تھکی ہاری پروفیسرنی کی طرح ہندوستان کے کسی کالج میں لڑکیوں کو ہسٹری پڑھا رہی ہیں۔ بہت جلد وہ سمے آنے والا ہے جب میری شہرت بھی ختم ہو جائیگی۔ رقص کے متعلق کتابوں میں ایک آدھ پیراگراف میرے سارے وجود کا ماحصل رہ جائے گا۔ شریمتی سُریکھا دیوی جو دس سال قبل بہت عظیم رقاصہ تھیں۔ طلعت کو لوگ بھول جائیں گے۔ کملا گمنام ہو جائیگی۔ اس وقت ہم میں اور روشن میں کیا فرق رہے گا۔"

"ایسی ڈی کیڈنٹ باتیں مت کرو۔" طلعت نے ڈانٹا۔

"مَیں تو ایسے ہی کہہ رہی تھی"۔ سُریکھا نے ذرا شرمندہ ہو کر کہا۔

"مَیں یونہی سوچ رہا تھا"۔ کمرے کے دوسرے سرے پر ہری شنکر نے کمال سے کہا۔ "لڑکیوں کا معاملہ بڑا بیڈھب ہے۔ ذرا ان کو تو دیکھو کیسی مگن ہیں اس سمے۔ ایک نے نیا بلاؤز سی لیا ہے تو خوشی سے پھولے نہیں سماتی۔ دوسری اِدھر اُدھر کی بے ضرر گپیں مار کر مسرور ہے۔ مگر دراصل انہیں کتنے عظیم دکھ اٹھانے پڑتے ہیں۔ یہ ایک بچے کی تخلیق کے ذریعے ساری کائنات کی ذمہ داری سنبھالتی ہیں۔ بےچاریاں اپنے آپ کو ایک دوسرے انسان کے حوالے کر دیتی ہیں۔ ان کا دل رکھنا کتنی آسان بات ہے۔ کتنی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے خوش ہو جاتی ہیں یہ لوگ۔ ان کو تو دیوی بنا کر رکھنا چاہیئے۔ ان کا دل دکھانا سب سے بڑا گناہ ہے"۔

طلعت ہری شنکر کی طرف آئی۔ ہری شنکر بھی مبالغے سے کام لے رہا تھا۔ یہی مبالغہ طلعت کو ہر طرف نظر آتا تھا۔ گوتم، شیلے، ہر کے کردار میں۔ چمپا میں۔ اپّی میں۔ یہ لوگ گویا انسانوں کی اٹھارہ جذب تصاویر تھیں۔ اسی مارنے کبھی کبھی تو کس سے باہر ہو جاتی تھیں۔ "میاں کیا بے تکی ہانک رہے ہو۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "یہ تجربے کسی اور کو دینا۔ کہاں کی دیوی اور کیسے دیوتا۔ یہ شاعری رکھو چھپر پہ۔ معاشی آزادی اصل چیز ہے۔" طلعت نے کہا۔

"یہی بات تو تمہاری سمجھ میں نہیں آتی۔ معاشی آزادی اصل چیز ہوتی تو چمپا بیگم اس سمے باغ میں چپ کر نہیں کاٹ رہی ہوتیں۔"

"اونہہ۔ ان کا تو دماغ خراب ہے"

"اے لیجئے اتنی قابل لڑکی۔ کیمبرج میں سب پہ دھاک بٹھا کر آ رہی ہے جس سے ملتی ہے وہی فلور ہو جاتا ہے۔ آپ ان کا دماغ خراب بتائے دے رہی ہیں۔"

"کیوں بھئی کمیونسٹ لوگ عشق نہیں کرتے۔" طفیان صاحب نے نہایت بھونڈے پن سے گلشن سے سوال کیا۔

لا حول ولا قوۃ طلعت جل کر واپس چلی گئی۔

"بی بی" ہری شنکر نے اس سے بڑے پیار سے کہا (وہ نرملا کی قائم مقام تھی) ابھی تم اور پڑھو۔ اب تم لگے ہاتھوں پی ایچ ڈی کر ہی ڈالو۔ کون مردود کہتا ہے کہ معاشی آزادی ضروری نہیں۔ اپنا دل چھوٹا نہ کرو۔" وہ یکلخت گھبرا گیا کہ اس نے طلعت کو خفا کر دیا ہے۔

"پی۔ ایچ ڈی کر کے بڑے لڈو مل جائیں گے۔" "تین سو کی ملازمت صرف تین سو کی۔" اس نے ہری شنکر کی ناک کے آگے تین انگلیاں لہرائیں۔ وہ بالکل ہنسنے کے موڈ میں نہیں تھیں۔ دراصل بھیا صاحب کی شادی کی خبر نے اس کی طبیعت مکدر کر دی تھی۔ اسے اس وقت پہلی بار احساس ہوا تھا کہ شادی کی کتنی زبردست مارکیٹ ہے جس میں لڑکیاں خواہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں یا جاہل جیسٹ برائے فروخت دکان

رکھی جاتی ہیں۔

"ارے تو روپیہ ہی تو سب کچھ نہیں ہے۔ نیا ہندوستان ہے ہم سب کو اُس کے لیے کام
ا ہے۔ کملا کو دیکھو۔ سوت کو۔ سوت کو کیسی ٹھاٹھ دار کر یہ دمین ہیں"

چمپا نے ٹہلتے ہوئے ایک مرتبہ کمرے میں جھانکا۔ اور اِن سب کو باتوں میں مصروف
ر باغ میں سے گزرتی باہر سڑک پر آگئی۔

برفباری شدید ہو گئی۔ شنیلا دیوی نے کھڑکیاں بند کر دیں۔

سوامی دیو نکا نند نے گیتا کا صفحہ الٹ کر مجمع کو دیکھا۔ یہ وہی کمال اور ہری شن
انگریزی پروفیسر تھے۔ جو تیرہ چودہ سال قبل ایک روز لا مارٹینیر کالج لکھنؤ سے اچانک غا
ہو گئے تھے۔ اور کمال اور ہری شنکر اُن کے تعاقب میں ہردوار کی گھاٹیوں میں مار
مارے پھر رہے تھے۔ اب زعفرانی کپڑے پہنے داڑھی بڑھائے یورپ اور امریکہ میں پی
دیتے پھرتے تھے۔ گوتم نے شنیلا مکرجی کے فلیٹ میں پہنچ کر کھڑکی میں سے جھانکا تو
یہ منظر نظر آیا کہ سوامی جی چند مشرق پسند انگریز لڑکیوں میں گھرے بیٹھے ہیں۔ ایک ط
کیرتن ہو رہا ہے۔ شنیلا مکرجی سب کو کافی پیش کرنے میں مصروف ہیں۔

گوتم اسی صبح کئی ماہ بعد ماسکو سے لوٹا تھا۔ کمال نے اس کے توسط سے ہندوستان
مختلف ملازمتوں کے لئے جو درخواستیں دے رکھی تھیں ان کے جواب میں انڈیا ہاؤس میں گ
کی میز پر بہت سے لفافے آئے رکھے تھے۔ گوتم اُن کو کھولے بغیر خوشی سے ہڑبڑا کر
کو سارے میں ڈھونڈتا پھرا۔ مسز کھنّا کے یہاں معلوم ہوا کہ کمال اور ہری شنکر اپنے پرا
دوست پروفیسر سے ملنے شنیلا مکرجی کے یہاں گئے ہوئے ہیں۔ مگر وہ لوگ یہاں بھی نہیں
گوتم اندر آ کر ایک کونے میں مائیکل کے پاس بیٹھ گیا۔

"ہلو کامریڈ۔ ماسکو واپس کب لوٹے۔" مائیکل نے چپکے سے پوچھا۔

"آج صبح۔"

"بھئی یہ تمہارے سوامی جی تو بالکل فراڈ معلوم ہوتے ہیں۔"

"ہوں گے مجھے ان میں دلچسپی نہیں ہے۔ تم نے کمال کو دیکھا ہے؟"

"نہیں۔" مائیکل نے اپنی بات جاری رکھی۔ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ امریکہ اُن کو
بھیجنا چاہتا ہے کہ مذہب کا پرچار کریں۔ اور کانگریس آف کلچرل فریڈم کی طرف سے یہ دورے

ہیں۔"

"تم ابھی اسرائیل نہیں گئے؟"

"بس اب جانے ہی والا ہوں۔"

"سب جا رہے ہیں۔" شیلا دیوی مائیکل کی بات سُن کر ان کی طرف آئیں۔ "نومشکار۔ مسٹر سیلو مبر" انہوں نے کہا۔

"نمسکار شیلا دیوی۔"

بہت سے پھول اُٹھائے نرگیش کمرے میں داخل ہوئی۔ "روشنی میں آ کر دیکھا تو یہ سب سُرخ نکلے۔ میرا خیال تھا زرد ہوں گے۔" اس نے سوامی جی کے سامنے پھول رکھ کر کہا۔

"نرگیش۔" گوتم نے آزردگی سے نیچی آواز میں کہا۔ "یہ کیا سوانگ رچا رہی ہو۔"

"گوتم۔ کلچر کی خاطر۔ یہ سب کلچر کی خاطر ہے" اس نے بھنچے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

"کمال کہاں ہے۔"

سر کھجا کے پان دو بچھ لیا۔ "شاید وہ لوگ مڈہرسٹ سے نہ لوٹے ہوں۔"

"مڈہرسٹ۔" گوتم کے ذہن پر ایک موگرا سا پڑا۔ "مگر آج تو اتوار نہیں ہے۔"

"ہاں لیکن نرملا کے دوسرے پھیپھڑے کا آپریشن ہوا ہے تم کو معلوم نہیں۔ ارے ہاں تم آج ہی تو باہر سے لوٹے ہو۔"

"سب جا رہے ہیں۔ سب اپنے اپنے اسرائیل کی طرف جا رہے ہیں۔" شیلا مکرجی نے آنکھیں نیم وا کر کے گوتم سے کہا۔ "تم لوگوں کی پوری پارٹی ہندوستان واپس جانے والی ہے۔ نرگیش نے آج بتایا مائیکل بھی جا رہا ہے۔ ذہین کو نیروبی کی یونیورسٹی میں یہ دفیسری مل گئی ہے۔"

"شیلا دیوی یہ تو دُنیا کا قاعدہ ہے۔ گوتم نے سخت اکتا کر کہا۔" لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔"

"یہ تو مجھے معلوم ہے۔ لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ بلکہ چلے جاتے ہیں۔ آتے کبھی نہیں۔" اب وہ بھی گرو دیو ٹیگور کا حوالہ دینے والی تھیں۔ گوتم جلدی سے اُٹھا۔ "نرگیش" اس نے مڑ کر کہا۔ "مجھے کمال کی بڑی سخت تلاش ہے۔ اس کے نام چند بیحد ضروری خط آئے ہیں۔"

"بی بی سی کینٹین میں دیکھ لو۔ یا شاید چونٹے کی سرائے میں ہوں وہ سب۔ سوا
سے تو ملتے جاؤ۔"

ارے ہاں۔ وہ آگے بڑھ کر سوامی جی کے سامنے جھکا اور اُن کے پیر چھوئے۔ سو
دیویکانند جی۔ سابق ڈاکٹر رچرڈ ہملٹن نے اُسے اشیرواد دی۔ اور آوکسفرڈ کے لہجے میں
اس کی روح کی خیریت دریافت کی۔

"مجھے تمہارا ہی انتظار تھا کہ تم آجاؤ تو ایک روز اسٹیون اسپنڈر وغیرہ کو اپنے یہا
بلوا کر ایک محفل منعقد کریں۔" شیلا دیوی نے کہا۔ "سوامی جی سے میں نے تمہارا بہ
ذکر کر رکھا ہے۔"

گوتم دوبارہ جھکا اور سب کو نمسکار کرتا ہوا باہر نکلا۔ سڑک پر برفباری جاری تھی
اور کوٹ میں منہ چھپا کر تیز تیز قدم رکھتا کار کی طرف چلدیا۔ شیلا مکرجی کے فلیٹ
کیرتن کی آوازیں بلند ہوتی رہیں۔

چونٹے کی سرائے اس وقت غیر معمولی طور پر سنسان پڑی تھی۔ صرف ایک لڑ
دروازے کی طرف لپشت کئے اونچے اسٹول پر بیٹھی کافی پی رہی تھی۔ گوتم ڈیڑھ سے
کے لئے کاؤنٹر کی طرف بڑھا۔ کہ بی بی سی والے تو ادھر نہیں آئے تھے۔ اسٹول والی ا
نے اُسے مڑ کر دیکھا۔ وہ چمپا احمد تھی۔

"ہلو۔ یہاں تم موجود ہو؟" گوتم نے بیساختہ کہا۔

وہ اپنی جگہ سے اتر کر برابر کے اسٹول پر بیٹھ گئی۔ "تم ہی نے تو کہا تھا دنیا بہت مختصر
کہیں نہ کہیں ضرور ملیں گے۔ دوبارا۔"

"اب ایسی مختصر بھی نہیں ہے۔" گوتم نے ذرا بُرا مان کر کہا۔ "یہ ضروری نہیں ہے
ہر بات کو لٹرل سمجھ لیا جائے۔"

"لٹرل تو تم مانتے ہو باتوں کو۔"

"وہ کیسے۔" گوتم نے پھر کمال کی تلاش میں چاروں اور نظریں دوڑا کر پوچھا
"میں نے تم سے الجیرز میں کہا تھا کہ تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔ بڑی مابعد الطبیعا

تم اُس کو مجاز کی طرف لے گئے۔ یہ سب تمہارا قصور ہے۔" اس نے انگلی اُٹھا کر کہا
بعد الطبیعات کا ذکر مت کرو۔" گوتم نے بے انتہا چڑ کر کہا۔ "میں ابھی شیلا دیوی
یہاں سوامی دیویکا نندجی سے مل کر آرہا ہوں ___ تم نے کمال کو تو نہیں دیکھا۔"
"نہیں۔" چمپا نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ یہ آدمی پل پل میں کیسے رنگ بدلتا تھا آج بھی
میں مردوں کو سمجھ نہ پائی۔" تم نے مجھے فون کیا تھا اس روز۔ جون کارٹر کے یہاں
ڈپ جانے سے پہلے۔"
"ہاں کیا تو تھا۔" گوتم کو اپنا اس طرح بکھر جانا بالکل پسند نہ آیا۔ "کیونکہ تم
مجھے رنگ کیا تھا کیمرج سے لوٹ کر۔"
"گوتم۔ یہ تم کاٹنے کو کیوں دوڑ رہے ہو۔ بات بے بات۔ تم پہلے تو ایسے نہ تھے
تقریباً سات سال بعد تم سے ملی ہوں۔ ذرا تو تمیز سے پیش آؤ۔"
"چمپا۔" گوتم نے کہا: "میں اس وقت بے حد پریشان ہوں۔ کمال کے کئی ضروری خط ہیں
ان میں اسے دو تین دن کے اندر انٹرویو کے لئے دلی پہنچنا ہو۔ نرملا کا دوسرا آپریشن
ہے۔ تم چوبیس گھنٹے خوابوں میں کھوئی رہتی ہو۔ باقی کی دنیا ہر سمے تمہارے خوابوں
ساتھ کس طرح دے سکتی ہے۔"
"ارے"۔ وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔ "چلو کمال کو ڈھونڈتے ہیں۔ مجھے یہ سب معلوم نہ
تھا۔" گوتم نے اسے دیکھا۔ یہ کیسی عجیب دلکش عورت تھی۔
وہ سرائے سے باہر نکلے اور سُرکھا کے یہاں فون کیا۔ گلشن نے دوسرے سرے سے
جواب دیا۔ کمال کا پتہ نہیں۔ شاید سر ادوجر کے یہاں نرملا کی رپورٹ لینے گیا ہے۔"
سُرکھا ابھی راؤنڈ لے کے نہیں لوٹی۔ کمال نے کہا تھا کہ وہ سر روجر کے یہاں سے ہمارے گھر
آئے گا۔ تم آجاؤ میں کالج جا رہا ہوں۔ کنجی ہمسایوں کو دیئے جاتا ہوں۔"
"کوئی مذہر سٹ گیا ہے۔" گوتم نے پوچھا۔
"طلعت اور ہری شنکر گئے تھے۔ اگر تم بھی جا رہے ہو تو میرے یہاں سے ایک
سل لیتے جانا۔ نرملا کو بھجوانے کے لئے سُرکھا نے ڈائننگ ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ طلعت نے لے

جانا بھول گئی۔"

"اچھا میں ابھی آتا ہوں۔"

گوتم کار کی طرف لوٹا۔ اور وہ سینٹ جانز ووڈ کی طرف روانہ ہو گئے۔ آنٹ
کے یہاں سے کنجی لے کر وہ سُرلیکھا کے مکان میں داخل ہوئے۔ گیلری میں دو بڑے
بڑے مجسمے رکھے تھے۔ "ادہو ہماری طلعت نے بڑے زوروں سے سنگتراشی شروع کر
رکھی ہے۔"

"یہ آشا کے بنائے ہوئے ہیں۔" چمپا نے فوراً کہا۔

گوتم ٹھٹھکا۔ چمپا۔ طلعت اور ان سب کو کس قدر ناپسند کرتی تھی۔ اس نے اندا
لگایا۔ وہ ڈرائنگ روم میں گئے۔ اور باغ کی طرف کا بڑا شیشوں والا دروازہ کھو
اب برف پر مدھم سی دھوپ روشن تھی۔

"کتنا آرام دہ گھر ہے۔ سُرلیکھا اور گلشن کا۔" گوتم نے صوفے پر نیم دراز ہوتے ہو
کہا۔ باغ کی دیوار کے پرے سے موسیقی بلند ہو رہی تھی۔ فضا میں خوش گوار خنکی تھی۔ چمپا نے
آتشدان روشن کیا۔ گوتم کمرے کے ساز و سامان پر کاہل اور مطمئن انداز سے نظریں
دوڑاتا رہا۔ اُسے چمپا کی موجودگی کی وجہ سے برسوں بعد ایسا معلوم ہوا گویا وہ بڑا
بس اپنے گھر پہنچ گیا ہے۔ یہ بڑا غیر منطقی اور عجیب سا احساس ہے۔

کمرے میں ایک طرف کتابوں کی الماریاں تھیں۔ اقتصادیات۔ علامہ اقبال۔ فیض۔
کرشن چندر بھی سُرلیکھا کی کتابیں تھیں۔ موسیقی۔ بیلے۔ کریوگرافی۔ سارے میں نفیس آرٹسٹک
چیزیں سجی تھیں۔ جو سُرلیکھا اور گلشن نے سارے ہندوستان۔ عوامی چین اور یورپ میں
گھوم کر جمع کی تھیں۔ روس کا بیلالیکا۔ چین کے نوادر۔ ہنگری کی گڑیاں۔ اٹلی اور فرانس
پینٹنگز۔ کمرہ موڈرن انٹیریئر ڈیکوریشن کا بہت اچھا نمونہ تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ
یہ ایک آرٹسٹ اور خاصہ کا کمرہ ہے۔ پیانو پر مارگو فونٹین اور رابرٹ ہیلپ مین کی دستخ
شدہ تصاویر رکھی تھیں۔ جگہ جگہ بالی اور جنوبی ہند اور سیام کے رقاصوں کے چھوٹے
چھوٹے مجسمے سجے تھے۔ کونے میں سینے کی مشین دھری تھی۔ اور مردنگم اور ترکاری کی

کری۔ گوتم مسکرایا۔ یہ آرٹسٹ کا کمرہ تھا۔ مگر اس میں آرام اور بے تکلفی سے رہا جاتا تھا۔ زندگی کی اپنی سادگی اور بے تکلفی کا ہر جگہ متلاشی تھا۔

"میں نے یہاں بڑے اچھے لحے گذارے ہیں۔" اس نے کہا۔ "یہ بڑے پیارے لوگ ہیں نا" وہ کہتا رہا۔ "کمروں سے مکینوں کی شخصیت کس حد تک عیاں ہوتی ہے سوچو تو۔" وہ اٹھ بیٹھا۔ "چلیسی میں کملا کا الٹرا ماڈرن فلیٹ دیکھا ہے۔؟ کی آرائش سے معلوم ہوتا ہے کہ مکین شدید اینٹلکچوئیل۔ شدید خوش ذوق اور انتہائی اجی حس کا مالک ہے۔ اور ڈائریکٹ اس کے خیالات میں کوئی الجھاؤ نہیں ہے۔ سٹرلی میں زرینہ کا مکان بھی ایک آرٹسٹ کا مکان ہے۔ لیکن ستھرا خوبصورت اور گھریلو بنٹ جانز ووڈ میں طلعت اور کمال کا مکان عین بین گلغشان کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے۔ وہی ہنگامہ وہی افراتفری۔ سماہمی۔ مہمانداری۔ حد ہے محرم میں مجلسیں تک دونوں کرتے ہیں یہاں۔ میں نے واشنگٹن میں ہری شنکر کا فلیٹ دیکھا ہے جو بالکل سگھاڑ الی کوٹھی کا ایکسٹینشن معلوم ہوتا ہے۔ پھر شیلا دیوی کا کمرہ نشست جہاں ہر چیز شروع سے آخر تک پوز ہی پوز ہے۔"

"تم پوز اور غیر پوز میں فرق کیسے معلوم کر لیتے ہو۔" چمپا نے اس کی بات کاٹی۔

"نہیں چمپا۔" وہ کہتا رہا۔ "ہم خود کو اپنے پس منظر سے اپنے ظاہر کو اصلیت سے بھی علیحدہ نہیں کر سکتے۔" پھر وہ رکا۔ "مگر کتنی عجیب بات ہے کہ میں نے آج تک تمہارا اصل پس منظر نہیں دیکھا۔ جونے کی سرائے کے اسٹول پر بیٹھی تم بالکل نہیں معلوم ہوتا تھا کہ بنارس سے آئی ہو۔ عجیب بات ہے نا۔"

"اچھی بات ہے یا بری۔؟"

"پتہ نہیں مگر ہمیں اپنے پس منظر سے وفادار رہنا چاہئیے جو شاید تم نہیں رہیں۔"

"یہ غلط ہے" چمپا نے سرخ ہوتے ہوئے کہا۔ "میں بنارس واپس جانا چاہتی ہوں مگر مجھے کوئی لیجانے والا نہیں ملتا۔"

وہ خاموش ہو گیا۔

"تم سب الگ الگ دور دور نکل گئے ہو۔ میں تنہا کھڑی ہوں۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی۔ پھر تم شکایت کرتے ہو کہ میں وفادار نہیں رہی۔"

"تم کو معلوم ہے گوتم نے کہا۔ "پچھلے سال میں نے تم کو امریکہ سے خط لکھا تھا میں ایک بیحد خوبصورت علاقے میں گیا ہوا تھا۔ ہاں ایک دیودار کے جنگل میں بیٹھ کر میں نے تم کو خط لکھا۔ اِن دنوں نہیں جانے کیوں بے حد خوش تھا۔ مجھے یہ دفعتاً اپنے خوش ہوتے رہنے کی وجہ آج تک سمجھ میں نہیں آئی۔ بہرحال میں نے تم کو لکھا تھا خط ایک عدد۔ مگر شاید تم کو وہ ملا ہی نہیں۔"

"مجھے آج تک کوئی خط نہیں ملا۔"

"اب تم پھر رومانٹک ہوئیں۔"

برابر کے مکان میں آشا کے یہاں کسی نے اونچی آواز میں گانا شروع کر دیا۔

"تو تم کیسے پن پر مت اترا دو" اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"تمہارے بنارس واپس جانے کے راستے میں کون سی چیز حائل ہے اور تم روتی کیوں ہو بھائی۔ زندگی میں آنسوؤں کی کمی تو نہیں کہ تم یونہی رونا شروع کر دو بیٹھے بٹھائے۔ ہنسا کرو۔ مثال کے طور پر بھیا صاحب کو لو۔ آج میں نے اُن کو سلفرج سے نکلتے دیکھا۔ اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ اس قدر خوش تھے کہ کیا بتاؤں کھلے جا رہے تھے۔ بڑے تپاک سے اُنہوں نے میرا تعارف اپنی بی بی سے کروایا۔ میں نے بھی بہت بشاش محسوس کیا۔ دماغی طور پر صحت مند لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ جیسے بھیا صاحب ہیں۔"

"بکواس مت کرو" چمپا نے کہا اور آتش دان کے کوئلے ٹھیک کرنے میں مصروف ہو گئی۔

گانے کی آوازیں اب قریب تر ہو گئیں۔ اوجینت اور ترونا کی آواز ان سب میں اونچی تھی۔ چمپا دریچے کے قریب جا کر سنتی رہی پھر واپس آگئی۔

"دریچہ بند کر دو۔" گوتم نے صرف کہا۔

"ہاں چمپا نے جواب دیا۔" یہ تو رات گئے تک ہلڑ مچتا رہے گا۔ لندن مجلس والوں کی اس

کے علاوہ اور کوئی کام نہیں ہوتا۔"

"ارے رے" گوتم نے چونک کے کہا۔" وہاں تو شاید کمال بھی پہنچ گیا ہو۔ یہ لوگ
رَت جگا کیوں کرنے والے ہیں۔؟"

"صبح یہ سب بوڈاپیسٹ جا رہے ہیں۔ اِس لئے "

"بوڈاپیسٹ ۔؟"

"ہاں وہیں بالکل وہیں۔ نیلی ڈینیوب کے کنارے۔"

گوتم نے کان لگا کر آوازیں پہنچاننے کی کوشش کی۔

" وہی سارے پرانے کورس ہیں اور اپ ٹو ۱۹۲۸ تک کے گیت۔" چمپا نے اکتاہٹ سے کہا
ابھی تمہارا جی اِن گانوں سے نہیں بھرا۔"

"اِن گانوں سے میرا جی کس طرح بھر سکتا ہے چمپا بیگم۔ ؟"

"اوہ میں بھول گئی تھی۔ کامریڈ گوتم۔ مگر تم ہی نے کہا تھا کہ دریچہ بند کر دو۔"

اب وہ "بوجھ اُٹھا لو ہیا ہیا" گا رہے تھے۔ گوتم نے بار بار جا کر باغ کی دیوار سے
جھانکا بہت سے لوگوں کو ہاتھ اُٹھا کر دیکھا اور واپس آ گیا۔" نہیں کمال وہاں نہیں ہے۔"

"گوتم۔ باشنٹر۔"

"ہاں بھائی۔"

"کیا میں بہت ہی بیوقوف ہوں۔؟"

"نہیں تو لیکن کچھ ایسی زیادہ عقلمند بھی نہیں۔"

"بس میں یہی پوچھنا چاہتی ہوں۔ اچھا ہوا تم نے بتلا دیا۔ اب مجھے اطمینان رہے گا"

"گرد گوتم کو بلاؤ۔ گرد گوتم کہاں ہے۔" آنشا کے گھر میں سے صدائیں بلند ہوئیں
"گرد گوتم سر تجھا کے یہاں بیٹھا ہے۔" کسی نے جواب دیا۔

وہ باہر جا کر دوستوں سے باتوں میں مصروف ہو گیا۔" میں نہیں آ سکتا ایک بے حد
ضروری فون کا انتظار کر رہا ہوں۔"

مگر دوسرے لمحے وہ دیوار کود کر گانے والوں کی منڈلی میں جا شامل ہوا۔ چمپا

پھر اکیلی رہ گئی۔ اس کی دنیا کی کشش اس کیلئے زیادہ طاقتور ہے۔ یہ مجھے معلوم ہونا چاہئے۔

بہت دیر بعد وہ سہرکھیا کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا "کمال کا فون تو نہیں آیا تھا۔؟" اس نے سوال کیا۔ چمپا آتشدان کے سامنے قالین پر بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ "نہیں" اس نے جواب دیا۔ گوتم نے اس طرح اُسے تنہا چھوڑ کر آشا کے یہاں چلے جانے کی معذرت نہیں کی۔ وہیں بیٹھ کر وہ بھی ایک کتاب پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ "یار چاء بنائی جائے۔" کچھ دیر بعد اس نے تجویز کیا۔

"تم آشا کے یہاں پی کر نہیں آئے"؟

"ہاں مگر تم نے جو نہیں پی ہو گی۔ آشا تم کو اتنی دیر تک آوازیں دیتی رہی۔ تم وہاں آئیں کیوں نہیں۔ اب تم بنالو چار اپنے لئے۔"

"بہت جلد تم کو میرا خیال آیا۔" چمپا نے کہنا چاہا۔ مگر وہ جھگڑنا نہیں چاہتی تھی یہ اس قدر واہیات نسوانیت ہوتی۔ وہ چپ چاپ اُٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔

"آنا بھی ہے چولہا سلگانا۔" گوتم نے پیچھے سے مذاقاً آواز لگائی۔

"بنارس میں میری اماں خود کھانا پکاتی ہیں۔" اس نے مختصراً کہا۔

"مگر تم تو کیمبرج پلیٹ ہو۔!"

"اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"چمپا رانی" گوتم آکر باورچی خانے کے دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ "آخر اس قدر افسردہ کیوں نظر آرہی ہو۔"

"اور کیا کروں۔ ناچوں۔"

"یہ تو کوئی جواب نہ ہوا۔ تم تو ایک زمانے میں بڑی سخت بذلہ سنج تھیں۔ وہ دیکھو توس جلا دیا تم نے۔"

"افسوس طلعت یہاں موجود نہیں جو تم کو پکوان بنا کر کھلاتی۔"

"چمپا ایسی واہیات باتیں مت کرو۔"

"گوتم" چمپا نے کیتلی اٹھاتے ہوئے رسان سے کہا "اگر تم چاہتے ہو میں یہاں سے چلی جاؤں تو میں ابھی چلی جاؤں گی۔ اور آئندہ تم سے کبھی ملنے کی کوشش نہ کرونگی غلطی میری ہی تھی کہ میں نے اتنے برسوں تم سے دوبارہ ملنے کی آس لگائے رکھی۔"

"چمپا رانی۔" گوتم باورچی خانے میں آگیا اور ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا سر اپنے ہاتھوں پر ٹکا دیا۔ "چمپا رانی" اس نے بھاری آواز میں کہا۔ "اصلیت جاننا چاہتی ہو۔ اصلیت یہ ہے کہ میں اپنے آپ سے ڈر رہا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں تم سے کیا بات کروں۔ تم مجھ کو کیا بتانا چاہتی ہو اور میں تمہیں کیا سنانے کا متمنی ہوں۔ اتنا طویل وقفہ گذر چکا ہے۔ اور ظاہری طور پر ہمارے پاس باتیں کرنے کے لئے کوئی مشترکہ موضوع نہیں ہے۔ سوائے ان خرافات کے جو ہم پچھلے دو گھنٹے سے دہرا رہے ہیں۔" اس نے سر اٹھا کر چمپا کو دیکھا۔ واقعہ یہ تھا کہ وہ چہرہ پہلے کے پاس کڑی اور زیادہ خوبصورت نظر آرہی تھی۔ اس نے چمپا کو آج تک اتنے گھریلو اور پرسکون ماحول میں نہیں دیکھا تھا۔

وہ چاو بنا کر ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ "ادھر آجاؤ" اس نے ذرا درشتی سے کہا گوتم اس کی آواز کی درشتی سے ڈر سا گیا۔ وہ پھر آتشدان کے سامنے آن بیٹھے۔ محض کوئی بات کرنے کی خاطر۔ گوتم نے دارجلنگ کے ایک بیگ کو چھوا جو کرسی پر رکھا تھا "کتنا خوبصورت ہے" اس نے کہا۔

"اس میں اپنے یہ کاغذات رکھ دوں۔۔؟"

"رکھدو۔"

اس نے لفافے بڑی احتیاط سے بیگ میں ٹھونس دئے۔ اب باتیں پھر ختم ہوگئیں۔

"اس بیگ میں" اس نے گلا صاف کر کے کہا۔ "تمہارا سامان ہے نا۔ چلتے وقت یہ کاغذات نکال دینا ورنہ سب گڑبڑ ہو جائے گا۔

"زیر بحث بیگ" چمپا نے تلخی سے کہا "میرا نہیں سُرکھیا کا ہے۔ اس میں تم اپنا سامان رکھ سکتے ہو۔ اسے اپنے گھر لیجا سکتے ہو۔ میری اور تمہاری کوئی چیز مشترک نہیں ہے

نہ یہ بیگ۔ نہ کاغذات۔ نہ یہ مکان۔ چیزیں۔ حتیٰ کہ یادیں کچھ بھی نہیں۔ جس میں تمہارے ساتھ حصہ لگا سکوں صرف دکھ مشترک ہے۔ لیکن تم اپنے دکھ کو بھی اپنے لئے ہی محفوظ رکھنا چاہتے ہو۔؟"

گوتم خاموش رہا۔

"کیا تم کو معلوم ہے گوتم نیلمبر کہ گو پچھلے سات سال سے میں نے تم کو نہیں دیکھا مگر مجھے پتہ ہے کہ تم ہر سمے سوتے جاگتے۔ اٹھتے بیٹھتے اپنے خلاف گواہی دیتے رہے ہو۔؟"

"ٹھیک ہے میں جس سے بات کرتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے میرا مخاطب میرا کنفیسر ہے میں سارا وجود میرا اعتراف ہے۔ میں نے کتنے قتل کئے ہیں۔ تم کو مارا ہے۔ اپنے آپ کو ختم کیا ہے۔ میرا جرم تمہارے جرم سے مختلف ہے۔ تمہارے اندر معصومیت کا جرم چھپا ہوا ہے ایک بات بتاؤ" اس نے کچھ رک کر کہا: "تصور گناہ تمہارے نزدیک کیا ہے؟"

"کسی کا دل دکھانا" چمپا نے سوچ کر جواب دیا۔

"اور ۔۔؟"

"ریاکاری ۔"

"اور ۔۔؟"

"اور کمینہ پن" اس نے دماغ پر اور زیادہ زور ڈال کر کہا

"سنڈے اسکول کے سبق ۔" گوتم نے سرسری انداز میں کہا۔

"ایں؟" چمپا نے اس کی بات اچھی طرح نہ سمجھی۔

"میں نے دل دکھایا ہے تمہارے نزدیک یہ سب سے بڑا گناہ ہے۔؟"

"بہت بڑا"

"لیکن تم کو جلد یہ معلوم ہو جائے گا چمپارانی کہ راستے میں بعض ایسے موڑ آتے ہیں جب کسی دوسرے کا دل دکھانا بالکل ناگزیر اور لازمی ہو جاتا ہے"

"قاتل بھی قتل کرتے وقت یہی سوچتا ہے کہ یہ قتل بالکل ناگزیر اور لازمی ہے ورنہ

وہ قاتل ہی کیوں بنتا ؟"
"گوتم پھر خاموش ہو گیا۔
"میرا دو بچے نیچے ہونے جا رہے ہیں۔" کچھ دیر بعد اس نے باہر کی آوازوں پر کان لگاتے ہوئے کہا۔ "مگر ہارمنی کی طرف بڑھتے ہوئے دفعتہ رک گئے ہیں۔" اس نے پیانو کے نزدیک جا کر پردوں پر انگلیاں پھیریں۔
"اس کا ایک سُر کہیں سے ٹوٹ گیا ہے۔" چمپا نے کہا
"مجھے معلوم ہے پیانو میں اکثر چوہے اپنا گھر بنا لیتے ہیں۔ میرے پیانو میں بہرائچ میں اکثر آدھی رات کو ایک پیارا موٹا سا چوہا اندر تاروں پر دوڑ دوڑ کر اکثر سمفنی بجایا کرتا ہے۔"
"تم نے مجھ سے بہرائچ کا ذکر کبھی نہیں کیا۔"
"بڑی پیاری جگہ ہے۔ کیونکہ میرا وطن ہے۔"
"ہم سب ایک دوسرے کے رحم و کرم پر زندہ ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ وقت میں مقید ہیں۔ یہ بڑی کوفت کی بات ہے۔" اس نے چند لمحوں بعد الجھ کے کہا۔
حالانکہ یہ وقت بڑا غیر حقیقی تھا۔ جس میں کمرے کی ہر چیز بے حد روشن اور واضح نظر آرہی تھی۔ باغ کے پھولوں پر سے برف پگھلنا شروع ہو گئی۔" گوتم نے توس کا ایک ٹکڑا اٹھا کر بلی کو پھینکا جو دریچے میں آن بیٹھی تھی۔ اس نے توس سونگھ کر چھوڑ دیا۔
"یہ بھی بوہیمین بلی ہے توس نہیں کھاتی۔ اس کیلئے لوبسٹر اور شیمپین لاؤ۔"
پھر وہ چمپا سے مخاطب ہوا۔ "چمپا تم نے اتنے دنوں بیکار میرا انتظار کیا۔ میں بالکل بوگس ہوں۔" وہ آتش دان کے پاس پہنچی اُسے خود بے حد غیر ضروری نظر آئی۔ غیر ضروری اور سخت بیوقوف اب بھلا اسی کیا تک ہے کہ اتنی گنوان ہونے کے باوجود مجھ جیسے لباڑی آدمی کی آس لگائے بیٹھی ہیں۔ حد ہے۔ بیوقوف لڑکی ہے اور سخت معصوم۔ بورژوا فلسفی بیچاری اگر اس کے دماغ کو کھرچا جائے اور اندر

ہے تو کتنی فالتو مٹی نکلے گی۔ ہزاروں سال پرانی مٹی۔ ٹیرا کوٹا۔" طلعت نے اتنے سارے
مشہور لوگوں کے سر بنائے ہیں۔ اس نے باآوازِ بلند کہا۔ "تم نے کبھی اس سے اپنا
سر بنوا کے نہیں دیا۔ اب بھی وقت ہے بنوالو۔ تم کہیں جا تو نہیں رہیں۔" اس نے
پُرامید لہجے میں پوچھا۔

"فی الحال تو نہیں۔ ہم ایک دروازے سے داخل ہوئے تھے۔ مگر باہر جانے کے
سب دروازے بند ہو چکے ہیں۔" "تمہاری اتنی معصومیت بھی غلط ہے۔" بیکار ایک دم دو
ٹہلتا ہوا مجسموں کی طرف چلا گیا۔ اور ان کے سر ٹھونک بجا کر دیکھنے لگا۔ "کیونکہ"
اس نے ایک مجسمے کی ناک چھوتے ہوئے کہا۔ "ہر دفعہ تم ہی بگڑی جاؤ گی۔ تمہارا خیال
ہے تم نے فیصلہ کر لیا اس لئے اب ہر بات آسان ہے۔ حالانکہ یہ اتنا آسان نہیں
ابھی تم پر اور مصیبتیں آئیں گی۔"

وہ دریچے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ لمحہ گھومتا جیسے کانٹا۔ ناچتا رہا۔ لمحے کا عجیب
دور دور تک پھیل گیا۔ ختم ہو گیا۔ باقی رہا۔ جگمگاتی ہوئی برف سے پھسلتی روشنی کمرے
میں داخل ہوئی۔ ہیئرن مکمل ترین بن گیا۔ وہ ساکت و صامت آتش دان کے پاس
بیٹھی رہی۔ کمرے کے تجربے میں بلی بھی شریک تھی۔ ہوائیں بھی جانتی تھیں۔ بہت دور
سڑک کی موٹریں راہگیر دوکانیں سب کچھ معلوم ہو چکا تھا۔

اب سارا وجود ایک کتاب ہے جسے میں پڑھ چکی ہوں۔ اور اننت سمے تک کئی بار
پڑھوں گی۔ چمپا نے اپنے آپ سے کہا

"دو دنیائیں ہر سمے میرے ساتھ رہتی ہیں ایک دنیا میں یہ سب لوگ ہیں۔" اس نے
کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ "دنیا میں صرف میں اور تم تنہا ہیں۔ دونوں کے درمیان ایک
پل ہے۔ جس روز یہ پل ٹوٹ گیا تو کیا ہوگا؟

"پل تم خود توڑ دو گے۔"

"نہیں لوگوں نے چاروں طرف مشینیں لگا رکھی ہیں۔ جھاڑیوں میں توپیں چھپی
ہیں اوپر بادل گرج رہے ہیں۔ ایک روز مجھے لگتا ہے لوگوں کی دنیا پاتال میں گر کر

غائب ہو جائے گی۔ میں باہر ہاتھ پاؤں مارتا رہ جاؤں گا۔ یہ سوچ کر دل ڈوب جاتا ہے"
"تم اپنی اسپوٹ لائٹ لئے چھت کی کڑیوں میں چھپے بیٹھے ہو۔ جو شامت کا مارا اسٹیج پر آتا ہے تم انتہائی کمینے پن سے اچانک لیمپ کا رُخ اس کی طرف کر دیتے ہو۔ وہ روشنی میں عیاں ہو جاتا ہے۔"
"میں خود بھی تو برابر اس روشنی میں ہوں۔"
"نہیں تم پردوں کے پیچھے چھپے رہتے ہو۔ اگر کسی روز ایک سرچ لائٹ تم پر پڑ گئی تو کیا ہوگا۔ اس دن تم اوپر کی منزل سے چھلانگ لگا کر سر پٹ نکل بھاگو گے کھڑکیوں میں جھانکتے پھرو گے۔ ہم لوگ تمہیں نظر آئیں گے۔ اسٹوو کے گرد بیٹھے بحثیں کرتے۔ کھانا پکاتے۔ کھاتے۔ تم کسی آوارہ گرد بلے کی طرح چاند کے مقابل میں چھت کے ٹائیلوں پر دبے پاؤں چلتے ہوئے آؤ گے۔ تمہارا چہرہ ہمیں کھڑکی میں سے نظر آئے گا۔ بوگی مین۔! (BOGEYMAN)
"اور اس سمے میں تمہارے ساتھ وہیں موجود ہوں گا۔ اسٹوو کے گرد بحثیں کرتا کھانا بناتا کھاتا اور تم مجھے کھڑکیوں میں جھانکتا دیکھو گی۔ لوگ دو مین۔"
وہ خاموش ہو گئے۔
وہ اچک اچک کر دیواروں کی تصویریں دیکھتا پھرا پھر دریچے کی طرف چلا گیا۔ "آج بہت برف پڑی۔" دریچے میں کھڑے ہو کر گوتم نے ایک اور جنرل اسٹیٹمنٹ دیا۔
ابھی اس کے بعد باقی ہے۔ "اس کے بعد" جو موت تک، ابد تک پھیلتا چلا جائے گا۔ موجود رہے گا۔ چمپا نے اپنے آپ سے کہا۔
"سر یچا کا باغ کتنا خوبصورت ہے۔" گوتم نے کمرے کی طرف پشت کیے کیے دوسرا بیان دیا۔
اس کی یہ میری کوئی قسمت نہیں۔ سنا ہے لوگوں کی قسمتیں ہوتی ہیں۔ چمپا نے اپنے آپ سے کہا۔

معاً وہ چونکا اور پیچھے مڑا۔ اس کا چہرہ دھلے ہوئے کپڑے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ سارا دن گذر گیا۔ سورج ڈھل گیا۔ شام آگئی۔ میں ابھی یہیں ہوں میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔ میں نے اتنا وقت برباد کر دیا۔ اتنا انمول ــــ انمول وقت ــ وہ بڑبڑایا۔ اور تیر کی طرح گیلری کی طرف بڑھا۔ ڈائینگ ٹیبل پر رکھے ہوئے پارسل پر اس کی نظر پڑی۔ اس نے پیچھے پلٹ کر چمپا کو نہیں دیکھا پارسل اٹھا کر وہ بگولے کی طرح باہر نکلا اور کار میں بیٹھ کر دیوانہ وار مذہب کی جانب روانہ ہو گیا۔
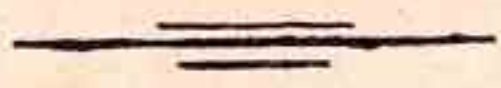
جیمز جوائس

جلا وطن

جیمز ڈفی کا مکان چیپلیزڈ میں تھا۔ اُسے حتی الامکان شہر سے دور رہنا پسند تھا۔ ڈبلن
کے مضافات میں بس یہی ایک جگہ اُسے پسند آئی تھی۔ دوسرے مقامات اس کے خیال میں بہت جدید عامیانہ
تصنع تھے۔ مکان پرانی ساخت کا تھا۔ اور اس کے در و بام سے سوگوارانہ اُداسی برستی تھی۔ ڈفی
کمرے کے دریچے سے وسیع میدان میں کھڑی ہوئی ایک غیر مستعمل ڈسٹلری نظر آتی تھی۔ ڈسٹلری
قریب ہی ایک اُتھلی ندی گذرتی تھی۔ ڈبلن اسی ندی کے کنارے آباد تھا۔ ڈفی کے بے قالین کمرہ
اونچی دیواریں تصاویر کے تکلف سے بے نیاز تھیں۔ کمرہ کا سارا فرنیچر اس کا اپنا خریدا ہوا تھا۔ لوہے
پلنگ، لوہے کا واش اسٹینڈ۔ چار بید کی کرسیاں۔ کپڑے رکھنے کا ریک ایک لکھنے کی میز۔
دان اور آتش دان کا جنگلہ۔ بس یہی چیزیں کمرے کی کل کائنات تھیں۔ دیوار میں ایک طاقچہ تھا جس
سفید لکڑی کی تختیاں لگا کر بک شیلف کا کام لیا جاتا تھا۔ بستر پر سفید بستر پوش اُڑھایا ہوا تھا
ئتی میں سرخ اُونی کمبل رکھا ہوا تھا۔ واش اسٹینڈ سے ذرا اُوپر دیوار سے ایک دستی آئینہ ٹنگا ہوا
ا۔ ایک سفید شیڈ والا لیمپ دِن بھر مینٹل پیس کی زینت بنا رہتا۔ طاقچہ میں کتابیں ترتیب وار رکھی
ئی تھیں۔ ورڈز ورتھ کا مکمل سیٹ نچلے حصّہ میں رکھا گیا تھا۔ اُوپر کے شیلف میں ایک مذہبی کتاب
نوٹ بک کے ساتھ کپڑے کے جزدان میں لپٹی ہوئی رکھی تھی۔ میز پر لکھنے کا سامان رکھا ہوا تھا۔
کی دراز میں ہاپٹ من کے ڈرامہ "مائیکل کرامر" کے ترجمہ کا مسودہ رکھا ہوا تھا۔ ڈرامہ اسٹیج کرنے کی
ایات سرخ روشنائی میں لکھی گئی تھیں اور یہ ہدایات کاغذات کی ایک تہہ کے ساتھ پن لگا کر رکھی ہوئی
یں۔ اِن کاغذات پر ایک جملہ بار بار لکھا گیا تھا۔ اور کسی ستم ظریفانہ لمحے میں ہاضمے کے لئے جوزن
کا ایک اشتہار کاٹ کر پہلے ورق پر چسپاں کر دیا گیا تھا۔ میز کی دراز کھلتے ہی کمرے میں ہلکی ہلکی مہک

پھیل جاتی ہو یا نو نبی بنسلوں کی ہوتی یا گوند کی یا پھر گل جانے کی حد تک پکے ہوئے سیب کی جو
خود فراموشی کے عالم میں دراز میں رکھ دیا گیا ہوتا۔

ڈینفی کو ہر قسم کی بے ترتیبی اور بد سلیقگی سے نفرت تھی۔ وہ بظاہر بہت خشک مزاج ا
آدمی معلوم ہوتا تھا۔ چہرے پر اس کی زندگی کے گذرے ہوئے برسوں کی ساری داستان مرقوم
چہرے کی رنگت ڈبلن کی سڑکوں کی طرح بھوری تھی۔ بڑے سر پر خشک سیاہ بال گندمی ر
مونچھیں جو دہانہ کی سختی اور کرختگی کو چھپانے میں ناکامیاب تھیں۔ گالوں کی ابھری ہوئی
سے طبیعت کی درشتگی اور بے رحمی تشریح ہوتی تھی۔ لیکن آنکھوں سے کسی قسم کی سفاکی یا ذ
کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ گندمی بھوؤں کے نیچے سے دُنیا کو دیکھنے والی یہ آنکھیں اپنی خاموشی
میں کہتی تھیں کہ ہم نے ہر شخص میں کوئی نہ کوئی اچھائی تلاش کرنے کی کوشش کی۔ ہم اس
میں زیادہ تر ناکام ہی رہی ہیں۔ ڈینفی نے کبھی راستے کے گداگروں کو بھیک نہیں دی۔ ا
چال میں استواری اور مضبوطی ہوتی۔ چلتے وقت وہ ہمیشہ ہاتھ میں ایک موٹی سی چھڑی ر
کی ایک انوکھی عادت یہ بھی تھی کہ وہ کبھی کبھی اپنے آپ کو مرحوم تصور کر کے اپنے بارے
نہ کوئی جملہ سوچتے رہتا۔

کئی سال سے وہ ایک پرائیوٹ بنک میں ملازم تھا۔ ہر صبح وہ ٹرام سے شہر آتا۔
میں کھانے کے لئے ڈان برگ چلا جاتا۔ کھانا بیر کی ایک بوتل اور چند بسکٹوں پر مشتمل ہوتا
نجے بنک بند ہو جاتا۔ رات کے کھانے کے لئے اس نے جارج اسٹریٹ کا ایک طعام خانہ منتخب
تھا۔ یہاں وہ اپنے آپ کو ڈبلن کے نمائشی نوجوانوں کے شور و شغب سے محفوظ سمجھتا تھا۔ اور پھر
کھانے کی قیمتیں بھی بہت مناسب تھیں۔ اکثر شامیں وہ یا تو مالکہ مکان کے پیانو کے سامنے گذ
یا پھر چہل قدمی کرتے ہوئے مضافات کی طرف نکل جاتا۔ موزارٹ اسے پسند تھا اور اسی سبب
کی وجہ سے وہ کبھی کبھی اوپیرا یا کنسرٹ میں بھی شرکت کر لیتا۔ اسکی زندگی میں اتنی ہی عیاشی
گذرتی تھا۔

زندگی میں اس کا کوئی رفیق یا دوست نہیں تھا۔ مذہب یا کسی مخصوص مکتبۂ فکر سے بھی ا
کوئی دابستگی نہیں تھی۔ اپنی روحانی زندگی میں وہ تنہا تھا۔ کرسمس کے موقعہ پر رشتہ داروں سے کبھی

ی عزیز کی موت پر اُسے آخری منزل تک پہونچانے میں ساتھ دینا۔ بس یہی وہ سماجی فرائض اس
نے ذمے لے رکھے تھے۔ وہ بھی محض روایات کے احترام کو برقرار رکھنے کے لئے ورنہ عام سماجی
کی رسوم و روایات کا وہ سرے سے قائل ہی نہ تھا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا کہ اگر کبھی حالات مجبور
تو شاید وہ بنک سے روپیہ بھی غبن کر سکتا ہے۔ لیکن کبھی ایسے حالات پیدا نہیں ہوئے اور اس کی
بے کیف یکسانیت کے ساتھ گذر رہی تھی۔

ایک شام وہ "روٹنڈا" میں بیٹھا ہوا تھا۔ پاس کی نشستوں پر دو خواتین بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہال
خالی پڑا ہوا تھا۔ لوگوں کی کمی اور خاموشی پروگرام کے ناکام ہونے کی علامت تھی۔ پاس بیٹھی
عورت نے ایک دو بار ویران ہال کی طرف دیکھا اور کہا "اُفوہ! کتنے کم لوگ آئے ہیں۔
ان خالی کرسیوں کے سامنے کوئی کیا خاک گا سکے گا۔" ڈیفی نے اس اظہارِ خیال کو دعوت
تصور کیا۔ اُسے کچھ حیرت بھی ہوئی کہ عورت نے گفتگو شروع کرتے ہوئے کوئی جھجھک نہیں
کی۔ دورانِ گفتگو میں ڈیفی کو پتہ چلا کہ عورت کے ساتھ بیٹھی ہوئی اس کی لڑکی اس کی بیٹی
ڈیفی نے اندازہ لگایا کہ یہ عورت اس سے بمشکل ایک آدھ سال عمر میں کم ہوگی۔ بات چیت کے
ن میں ڈیفی اس کے خد و خال کو ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ عورت کی شکل سے
ت کے آثار نمایاں تھے۔ اب بھی یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ یقیناً کبھی کافی حسین رہی ہوگی
چہرہ بیضوی تھا۔ اور چہرے کے نقوش کافی گہرے تھے! آنکھیں گہری نیلی اور پُرسکون تھیں
وں میں بیباکی تھی۔ لیکن پتلیوں کی حرکت سے طبیعت کے غیر معمولی حساس پن کا پتہ چلتا تھا۔
افانی جیکٹ سے سینے کا ابھار سرکشانہ انداز میں نمایاں تھا۔

کچھ دنوں بعد وہ اسے دوبارہ ایک کنسرٹ میں ملی۔ اس کی لڑکی بھی ساتھ تھی۔ لڑکی
ری طرف متوجہ ہوتی تو ڈیفی موقع پاکر عورت سے شناسائی بڑھانے کی کوشش کرتا۔ عورت
دو تین بار اپنے شوہر کا ذکر کیا۔ لیکن اس ذکر میں تنبیہہ کا عنصر شامل نہیں تھا۔ اس کا نام مسز سنگھو
اس کا شوہر ایک باربردار جہاز کا کپتان تھا۔ کمپنی کی کشتیاں ڈبلن اور ہالینڈ کے درمیان
تھیں۔ لڑکی کے علاوہ اور بچے نہیں تھے۔ تیسری دفعہ ایک اتفاقیہ ملاقات ہوگئی تو اس مرتبہ
فی نے ہمت کر کے دوبارہ ملنے کا وعدہ لے لیا۔ حسبِ وعدہ وہ ملنے کے لئے چلی آئی۔ یہ

پہلی ملاقات کئی ایک طویل ملاقاتوں کی ابتدا تھی۔ وہ ہمیشہ شاموں میں ملتے اور گھ
کے لئے عموماً خاموش ترین مقامات کا انتخاب کرتے۔ ڈیبی کو خفیہ حرکتوں سے بڑی
تھی۔ اور اس طرح چوری چھپے ملنا اُسے بڑا گراں گذرتا تھا۔ اس لئے اُس نے مسز
مجبور کیا کہ وہ اُسے اپنے گھر پہ مدعو کرے گھر پہ کپتان سینجو نے اس کا پُرجوش استقبا
کپتان کا خیال تھا کہ وہ اس کی لڑکی سے دلچسپی لے رہا ہے اپنی بیوی سے اس کی د
حد تک ختم ہو چکی تھی کہ اس میں کسی دوسرے شخص کی دلچسپی کا اُسے تصور تک نہ آسکتا
کپتان زیادہ تر شہر سے باہر رہتا تھا۔ اور لڑکی موسیقی سیکھنے کے لئے سکول ج
اس طرح ڈیبی کو مسز سینجو کی صحبت سے محظوظ ہونے کے موقع برابر ملتے رہے۔ یہ تج
دونوں کیلئے نیا تھا۔ اس لئے انہیں ان ملاقاتوں میں کوئی نامناسب بات نہیں معلوم ہو
رفتہ رفتہ وہ ڈیبی کی ذہنی زندگی کی رفیق بنتی گئی۔ وہ اسے پڑھنے کے لئے کتابیں
نظریات کا اظہار کرتا مسز سینجو ہمہ تن انہماک ہو کر اس کی ساری باتیں سنتی۔ ڈیبی نر
باتیں کرتا تو مسز سینجو اپنی زندگی کے تجربات بیان کرتی۔ وہ بڑی مادرانہ شفقت کے س
کو دل کھول کر باتیں کرنے پر آمادہ کرتی۔ ڈیبی نے بھی اُسے اپنا ہمراز بنا لیا تھا۔ ڈ
اسے بتایا کہ وہ کچھ مدت کے لئے آئرش سوشلسٹ پارٹی کا ممبر بھی رہ چکا ہے۔ پا
نشستیں ایک پس ماندہ محلے میں ہوتیں۔ کمرے میں تیل کا چراغ جلتا اور اس نیم اند
مزدوروں کے درمیان وہ اپنے آپ کو کافی اہم محسوس کرتا تھا۔ کچھ دنوں بعد پارٹی میں
الگ گروپ بن گئے۔ اور جب تینوں گروپ اپنے قائدین کے تحت الگ الگ مقامات
کرنے لگے تو اس نے ان نشستوں میں حصہ لینا ترک کر دیا۔ پارٹی کے ممبروں میں ہم
تھی۔ ان کے مباحث میں عام طور پر مزدوروں کی اجرت کے مسائل کو غیر معمولی اہ
دی جاتی۔ بعض بہ صورت حقائق پسندوں کو باقاعدگی اور اعتدال پسندی سے نفرت تھی
ان چیزوں کے لئے جس فرصت اور اطمینان کی ضرورت ہوتی ہے وہ انکی دسترس سے باہ
ان حالات کو دیکھ کر اسے یقین ہو گیا کہ ابھی کم از کم چند ایک صدیوں تک ڈبلن پر سماج
سے محفوظ تھا۔ مسز سینجو یہ باتیں سن کر پوچھتی وہ آخر ان خیالات کو قلمبند کیوں نہیں ک

ے لہجے میں کہتا "کس کے لئے قلمبند کروں؟" ان لفظی بازیگروں سے بازی لے جانے
ے جو ایک منٹ بھر سنجیدگی کے ساتھ کسی موضوع پر غور و فکر کرنے کے قابل نہیں، اس
نی طبقہ کی تنقیدوں کا ہدف بننے کے لئے جس نے اپنی اخلاقیات پولیس کے ذمہ دار اپنا
بھانڈوں کے سپرد کر رکھا ہے؟"

ڈیفنی اکثر ڈبلن سے باہر مسٹر سنگو کے کاٹیج کو چلا جاتا۔ اِن کی شامیں بالعموم ایک
کے ساتھ گذرتیں۔ رفتہ رفتہ جیسے جیسے وہ ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ ان کی
زیادہ قریبی موضوعات پر ہونے لگیں۔ اس کی قربت ڈیفنی کے واسطے ایک پیاسے
ے زرخیز زمین کی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ کئی مرتبہ باتیں کرتے کرتے اندھیرا ہو جاتا لیکن
چراغ جلائے بغیر ہی اندھیرے میں بیٹھے رہتے۔ الگ تھلگ کمرے کا اندھیرا
کانوں میں گونجتی ہوئی موسیقی کی لہریں انہیں ایک رفاقت کے رشتے میں منسلک کر دیتیں
اس سمندر کے احساس میں انہیں ایک کیفیت اور ایک سربلندی محسوس ہونے لگی تھی۔
ی خشونت اور مزاج کی کرختگی میں فرق آنے لگا تھا۔ جذبات کی ہلکی ہلکی لہریں ذہن کے
ے ہوئے پانی میں ہلکورے پیدا کرنے لگی تھیں۔ کبھی کبھی اسے خود اپنی آواز دور سے
تی معلوم ہوتی۔ اسے خیال آتا کہ وہ مسٹر سنگو کی نظروں میں فرشتوں سے بھی بلند ہوتا جا رہا ہے لیکن جب بھی وہ مسٹر سنگو کے
کی تندی اور گرم جوشی کے آگے خود سپردگی پر آمادہ ہو جاتا تو اس کا غیر منقسم وجود اس کے اندر سے چلا
تا کہ روح کی تنہائی سے مفر ناممکن ہے۔ ہمارا وجود ہماری ذاتی چیز ہے ہم اسے کسی اور کے حوالے نہیں
کتے۔ اس کشمکش کا خاتمہ بالآخر ایک رات کو ہو گیا۔ اس رات مسٹر سنگو غیر معمولی طور پر ہیجان زدہ
ں کر رہی تھیں۔ ایک مرتبہ انہوں نے بے اختیار ہو کر ڈیفنی کا ہاتھ اٹھا کر اپنے گالوں سے
یا۔ تو ڈیفنی ششدر رہ گیا۔ اسے یہ جان کر صدمہ ہوا کہ مسٹر سنگو نے اس کی باتوں کو اتنے
معنی پہنائے تھے۔ ایک ہفتہ تک وہ اس سے ملنے نہیں گیا۔ ایک ہفتہ کے بعد ڈیفنی نے
ے ملاقات کے لئے بلایا۔ پرانے مقام پر ملنا اس نے مناسب سمجھا۔ کیونکہ اس طرح ماحول سے
بستہ جذباتی یادوں کے اثرات اس ملاقات کے لئے سازگار نہ ثابت ہوتے۔ اس لئے اس
ملاقات کے لئے پارک گیٹ کے قریب ایک ہوٹل کا انتخاب کیا جو اُن کے مرد دن تھے۔

لیکن سردی کے باوجود کوئی تین گھنٹے تک دونوں پارک میں ٹہلتے رہے۔ دونوں ہمیشہ کے
تعلق پر رضا مند ہو گئے۔ ڈیبی نے مسٹر سینکو کو بتایا کہ دل کا یہ تعلق عمر کا بیش خیمہ ہو
پارک سے باہر نکل کر دونوں خاموشی کے ساتھ ٹرام کی طرف بڑھے۔ ٹرام کے قریب پہنچ
مسٹر سینکو کا بدن جذبات کے وفور سے اس طرح کانپنے لگا کہ ڈیبی گھبرا گیا۔ کہ کہیں یہ
جذبات کے دھاروں پر بہہ نکلی تو بڑی مشکل ہو جائیگی۔ اس خیال سے اس نے جلدی جلدی خدا
کہا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا الگ ہو گیا۔ چند دنوں بعد ڈیبی کو ایک پارسل ملا۔ اند
بنائی ہوئی کچھ موسیقی کی دھنیں اور کتابیں تھیں۔

چار سال گذر گئے۔ ڈیبی اپنی بچیاں اور باقاعدہ زندگی کی طرف لوٹ گیا۔ اس کا
اب بھی اس کے باترتیب ذہن کا آئینہ دار تھا۔ موسیقی کے کاغذات میں چند نئی دھنوں کا
ہو گیا۔ بک شیلف میں نطشے کی دو کتابیں شامل ہو گئی تھیں۔ میز پر رکھی ہوئی کاپی میں وہ
کم کچھ لکھتا تھا۔ مسٹر سینکو سے آخری ملاقات کے دو مہینوں بعد اس نے کاپی میں جو جملے لکھے تھے ا
ایک یہ بھی تھا۔ "دو مردوں کے درمیان محبت ناممکن ہے کیونکہ دونوں میں جنسی اختلاط
امکان نہیں ہوتا۔ اور ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان دوستی ناممکن ہے کیونکہ یہاں جن
اختلاط ناگزیر ہو جاتا ہے۔" اس نے اس ڈر سے ناٹک گھروں کا جانا بھی بند کر دیا تھا
مسٹر سینکو سے مڈبھیڑ نہ ہو جائے۔ اس دوران میں اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ بنک کا ایک
کاروبار سے علیحدہ ہو گیا۔ لیکن وہ اب بھی ہر صبح ٹرام سے شہر جاتا اور ہر شام جارج اسٹ
طعام خانے میں کھانا کھانے کے بعد شام کا اخبار پڑھ کر گھر واپس ہوتا۔

ایک شام وہ طعام خانے میں کھانے کو بیٹھا ہوا تھا۔ پاس ہی پانی کے گلاس کے
کھلا اخبار رکھا ہوا تھا۔ ایک نوالہ اٹھا کر وہ منہ تک لے گیا لیکن دفعتہً اس کی آنکھ
کی چند سطروں پر جم کر رہ گئیں۔ اس نے نوالہ رکابی میں واپس رکھ دیا۔ اور پورے انہما
اخبار کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ذرا دیر کے بعد اس نے گلاس اٹھا کر پانی پیا۔ رکابی ایک ط
سرکا دی۔ اور ٹیبل پر اخبار پھیلا کر وہی خبر بار بار پڑھتا رہا۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ ویٹ
سمجھا شاید آج کھانا ٹھیک نہیں بنا۔ اس کے قریب آ کر دریافت کیا لیکن ڈیبی کو کھانے

شکایت نہیں رہی تھی۔ اس نے بہ مشکل دو چار لقمے زہر مار کئے بل ادا کیا اور باہر نکل گیا۔

نومبر کی دھندلی شام میں وہ تیز قدمی سے چلنے لگا۔ جیب سے اخبار کا میلا کاغذ باہر جھانک رہا تھا۔ چھڑی کی آوازیں ایک باترتیب تسلسل کے ساتھ آرہی تھیں۔ پارک روڈ سے ...ڈ کی طرف تنہا راستے پر اس نے اپنی رفتار دھیمی کر دی۔ چھڑی بھی اب زمین پر آہستہ پڑ رہی تھی۔ تنفس بے قاعدہ ہو گیا۔ سانس لیتے ہوئے آہوں کی آوازیں سرد ہواؤں میں تحلیل ہو رہی تھیں۔ پہنچتے ہی سیدھا اپنے کمرے کا رُخ کیا۔ دریچے کے قریب جلتی ہوئی روشنی میں اخبار کھول دوبارہ پڑھنے لگا۔ اس کی زبان سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ لیکن اس کے ہونٹ اس طرح ...ے تھے جیسے کوئی راہب دعا پڑھ رہا ہو۔ خبر یہ تھی۔

سڈنی پریڈ میں ایک خاتون کی موت

ایک دردناک واقعہ

"آج شہر ڈبلن کے ہسپتال میں ڈپٹی کارونر نے ۴۳ سالہ مسز ایمیلی سینیکو کی لاش کا پوسٹ مارٹم کیا۔ متوفیہ کل شام سڈنی پریڈ اسٹیشن پر ہلاک ہو گئی تھیں۔ شواہد سے پتہ چلا ہے کہ متوفیہ ریل گاڑی پار کرتے وقت انجن کی زد میں آگئی تھیں۔ انجن کے ڈرائیور "جان" نے اپنے بیان میں کہا کہ گذشتہ پندرہ سال سے ریلوے کی ملازمت میں ہے۔ کل شام کو گارڈ کی سیٹی کے بعد جیسے ہی انجن آگے بڑھنے لگا باہر سے چیخوں کی آواز سنائی دی اور اس نے فوراً انجن روک ...ٹرین بہت آہستہ جارہی تھی۔

پی ڈن پورٹر نے کہا کہ ٹرین نکلنے ہی والی تھی کہ اس نے ایک عورت کو پٹڑی پھلانگتے دیکھا وہ چیختا ہوا اس کی طرف دوڑا لیکن اس کے قریب پہنچنے سے پیشتر عورت ...ن کے جنگلے سے ٹکرا کر زمین پر گر پڑی۔

ایک جیوری نے دریافت کیا "کیا تم نے عورت کو گرتے ہوئے دیکھا؟"

گواہ "جی ہاں"

پولیس سارجنٹ کروس نے کہا کہ وہ جس وقت جائے وقوع پر پہنچا تو متوفیہ کا بظاہر ...جان جسم پلیٹ فارم پہ رکھا ہوا تھا اور ایمبولنس کے آنے تک لاش اس نے ویٹنگ روم

میں رکھوائی۔

کانسٹبل نمبر ۷۵ نے اس بیان کی تصدیق کی۔

ہاوس سرجن ڈاکٹر ہالیسن نے بیان دیا کہ متوفیہ کی دو پسلیاں ٹوٹ گئیں تھیں کندھے پر اندرونی چوٹ لگی تھی۔ گرنے کی وجہ سے سر کا دایاں حصہ بھی زخمی ہو گیا تھا عام حالات میں یہ تمام زخم جان لیوا نہیں ہو سکتے تھے۔ لہٰذا اغلب یہی تھا کہ دہشت سے متوفیہ کی حرکتِ قلب بند ہو گئی۔

ریلوے کمپنی کی جانب سے مسٹر ایچ۔ پی۔ ہیبرسن فن لے نے اس حادثے پر سخت افسوس کا اظہار کیا۔ اور کہا کہ کمپنی اپنی طرف سے حادثوں کے روک تھام کا ہر ممکن طریقہ اختیار کرتی ہے ہر اسٹیشن پر لوگوں کو پٹڑیاں پھلانگنے سے منع کرنے کے لئے واضح ہدایات لگائی گئی ہیں۔ لیکن متوفیہ عموماً رات کا وقت ایک پلیٹ فارم سے دوسرے پلیٹ فارم کو پٹڑی پار کر کے جانے کی عادی تھی۔ اس کے علاوہ دیگر حالات کے پیش نظر بھی مسٹر فن لے کے خیال میں ریلوے کے حکام اس معاملے میں ملزم نہیں گردانے جا سکتے۔

متوفیہ کے شوہر کیپٹن سینکو نے اپنے بیان میں کہا کہ حادثے کے وقت وہ گھر پر موجود نہیں تھا۔ اور آج ہی صبح روٹرڈام سے واپس ہوا تھا۔ انکی شادی کو ۲۲ سال گزر چکے تھے۔ اور کوئی دو سال قبل تک ان کی شادی شدہ زندگی خاصی خوش گوار رہی لیکن دو سال سے مسز سنکو کے مزاج میں کافی بے اعتدالیاں پیدا ہو گئیں تھیں۔

مس میری سینکو نے کہا کہ اس کی ماں اپنے آخری دنوں میں راتوں کو شراب کے لئے باہر جانے کی عادی ہو گئی تھی۔ ماں کے حادثے کے وقت وہ باہر گئی ہوئی تھی حادثے کے کوئی ایک گھنٹے بعد گھر لوٹی۔

جیوری نے سرجن کے بیان سے اتفاق کرتے ہوئے انجن ڈرائیور کو الزام سے بری قرار دیا۔

ڈپٹی کارونر نے اس دردناک حادثے پر متوفیہ کے شوہر اور بیٹی سے اپنی گہری ہمدردی کا اظہار کیا اور ریلوے کے حکام کو مشورہ دیا کہ گو اس حادثے میں کسی کو ملزم نہیں قرار دیا جا

لیکن اس قسم کے حادثات کی روک تھام کے لئے اور زیادہ مضبوط انتظامات کئے جانے چاہئیں۔"

ڈیفی نے اخبار سے آنکھیں ہٹائیں اور دریچے کے باہر شام کی پھیلتی ہوئی اداسی کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ ڈسٹلری کے قریب ندی کا پانی خاموشی سے بہہ رہا تھا دور ایک مکان میں تھوڑی تھوڑی دیر کے وقفہ سے روشنی جل بجھ رہی تھی۔ یہ کیسا انجام تھا اس موت کی ساری تفصیل کتنی گھناؤنی اور نفرت انگیز معلوم ہو رہی تھی۔ اس عورت کو اس نے اپنی زندگی کی مقدس ترین باتوں کا رازدار بنایا تھا۔ یہ خیال متوحش اور شدید بنا رہا تھا۔ پامال گھسے پٹے جملے۔ کھوکھلی ہمدردی کا اظہار۔ ایک عامیانہ موت کی تفصیلات کو چھپانے کیلئے زرخرید اخباری نمائندے کے محتاط الفاظ ان سب چیزوں سے اسے متلی سی محسوس ہو رہی تھی۔ اس عورت نے اپنے ساتھ اسے بھی ذلیل کیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس عورت کی گھناؤنی اور نفرت انگیز زندگی کا نقشہ پھر گیا۔ اسے اس نے اپنی روح کا رفیق سمجھا تھا۔ اسے ان ذلیل لنگڑاتی ہوئی عورتوں کا خیال آ گیا جو نوٹنیر اور مختلف قسم کے برتن لئے ہوئے تاڑی خانوں کے پاس سنڈلاتی رہتی ہیں۔ خدایا یہ کیسا انجام تھا یقیناً وہ زندہ رہنے کے قابل نہیں تھی۔ اس کی زندگی کا کوئی آدرش کوئی مقصد نہیں تھا۔ اپنی عادتوں کی غلام، کردار اور شخصیت سے عاری ان ذلیل انسانی ڈھانچوں میں سے ایک جن پر تہذیب و تمدن کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ اسے کبھی گمان تک بھی نہ گذرا تھا کہ وہ اتنی گری ہوئی حرکت کر سکتی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنا بڑا دھوکا کھا سکتا تھا۔ اس بات اس کی گری ہوئی جذباتی حرکت اب اور زیادہ عامیانہ معلوم ہونے لگی تھی۔ اسے یقین آ گیا کہ اس عورت سے علیحدگی اختیار کرنے میں وہ بالکل حق بجانب تھا۔

شام کے بڑھتے ہوئے اندھیرے کے ساتھ اس کا ذہن بھٹکنے لگا۔ اسے اپنے ہاتھوں پر اس کے ہاتھوں کا لمس محسوس ہو رہا تھا۔ حادثے کا دھچکا اب اعصاب پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ جلدی سے اوورکوٹ پہن کر وہ باہر نکل گیا۔ باہر سرد ہوا نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا

سرد جھونکے کوٹ کی آستینوں میں گھسے جا رہے تھے۔ جیلنز ڈبرج کے قریب پہنچ کر وہ ایک شراب خانے میں داخل ہو گیا۔ شراب خانے کے مالک نے بغیر کسی گفتگو کے خاموشی اور احترام کے ساتھ بھرا ہوا گلاس سامنے لا کر رکھ دیا۔ کمرے میں پانچ چھ مزدور باتیں کرتے ہوئے تھوڑی دیر کے بعد بڑے بڑے مگوں سے بیئر پی رہے تھے۔ سگار پیتے ہوئے وہ فرش پر تھوکتے اور پھر جوتوں سے فرش پر پڑا ہوا لکڑی کا برادہ اس پر ڈال دیتے کچھ دیر بعد یہ لوگ بھی چلے گئے۔ ڈینفی نے ایک اور گلاس کا آرڈر دیا۔ اور دیر تک آہستہ آہستہ پیتا رہا۔ دوکاندار نیم دراز جمائیاں لیتے ہوئے اخبار پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا باہر تنہا سڑک پر کوئی اکی دکی ٹرام رات کے سناٹے میں گڑگڑاتی ہوئی نکل جاتی۔

یہاں بیٹھے ہوئے وہ اس عورت کے ساتھ اپنے گزرے ہوئے دنوں کا تصور کرتا رہا اب وہ یکے بعد دیگرے دو مختلف صورتوں میں نظر آ رہی تھی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ اب مر چکی ہے۔ وجود کی ساری ہماہمی سے اس کا رشتہ کٹ چکا ہے وہ صرف ایک یاد بن کر رہ گئی ہے۔ اس کی بے اطمینانی بڑھتی گئی۔ شاید وہ اس سے بہتر سلوک کر سکتا تھا۔ لیکن کیسا سلوک؟ وہ کھلے بندوں تو اس کے ساتھ نہیں رہ سکتا تھا۔ پھر دھوکوں کا کھیل کھیلنے میں کیا فائدہ؟ ان حالات میں اس سے بہتر راہِ عمل اور کیا ہو سکتی تھی؟ اسے کس طرح ملزم گردانا جا سکتا تھا؟ لیکن اب جب وہ ہمیشہ کے لئے جا چکی تھی تو اُسے احساس ہو رہا تھا کہ اُس کمرے میں تنہا اکیلی راتیں بسر کرتے ہوئے وہ کتنی تنہا زندگی گذارتی رہی۔ اب اسے خیال آ رہا تھا کہ اس کی اپنی زندگی بھی اس وقت تک تنہا رہے گی۔ جب تک وہ موت کے بعد وجود سے کٹ کر ایک یاد میں تبدیل نہیں ہو جاتا۔ یاد بشرطیکہ کوئی اسے یاد رکھے۔

وہ باہر نکلا تو نو بج چکے تھے۔ وہ اگلے دروازے سے پارک میں داخل ہو گیا۔ اور بے برگ و بار خزاں زدہ درختوں میں گھومتا رہا۔ ان روشوں پر گھومتا رہا۔ جہاں چار سال قبل وہ بھی اس کے ساتھ چلتی تھی! اندھیارے میں وہ اسے اپنے قریب معلوم ہو رہی تھی۔ کبھی کانوں کو اس کی آواز اور ہاتھوں کو اس کا لمس محسوس ہوتا وہ چلتے چلتے رک جاتا۔ اور غور سے سننے کی کوشش کرتا: میں نے کیوں اسے زندگی سے محروم کیا۔ میں نے کیوں اسے موت کے سپرد

کر دیا۔ کیوں کیوں، اُسے اپنا ضمیر ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

میگزن ہل کی چوٹی پر پہنچ کر وہ رک گیا۔ ندی کے پار ڈبلن نظر آرہا تھا بھروسات میں ڈبلن کی روشنیاں دور مبہم نواز انہ انداز میں چمکتی ہوئی سُرخ نظر آرہی تھیں۔ نیچے پہاڑ کے دامن میں پارک کی دیوار کے پاس چند لیٹے ہوئے انسانی سائے نظر آرہے تھے۔ یہ لوگ دُنیا کی نظروں سے بچ کر چھپ چھپ کر اپنی محبتیں پروان چڑھا رہے تھے مایوسی اور ناکامی کا احساس اسے اپنی گرفت میں لے رہا تھا۔ اسے پہلی دفعہ محسوس ہوا کہ زندگی نے اپنی ساری ہماہمی اور خوشیوں کے دروازے اس پہ بند کر دئیے۔ ساری زندگی میں ایک انسانی وجود نے اس سے محبت کرنے کی کوشش کی۔ اور اسی وجود کو اس نے مسرت اور زندگی سے محروم کر دیا۔ اسے ایک ذلیل اور شرمناک موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اُسے معلوم تھا نیچے لیٹے ہوئے جوڑے اُسے دیکھ رہے تھے وہ اس کے وہاں سے نکل جانے کے متمنی تھے کسی کو اس کی ضرورت نہیں تھی۔ زندگی کے ہنگامے میں اس کیلئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ ندی کا چمکتا ہوا پانی اداس سُست روی کے ساتھ ڈبلن کی طرف بل کھاتا ہوا جا رہا تھا۔ ندی کے اس طرف کنگس برج کے اسٹیشن سے نکلتی ہوئی مال گاڑی ایسے لگ رہی تھی۔ جیسے کوئی آتشیں سر والا کیڑا الیوری مستقل مزاجی سے تاریکی میں رینگتا جا رہا ہو۔ ٹرین آہستہ آہستہ نظروں سے غائب ہو گئی۔ لیکن انجن کی آوازیں بار بار اس کا نام دہرا رہی تھیں۔

وہ جس راستے سے آیا تھا اس راستے سے واپس لوٹنے لگا۔ انجن کی آوازیں کانوں میں گونج رہی تھیں۔ اپنے حافظے کی باتوں پر اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ ایک درخت کے نیچے رک کر انجن کی آواز ختم ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ اب اس کا قرب محسوس ہو رہا تھا نہ اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ چند لمحوں تک وہ کچھ سننے کی کوشش کرتا رہا لیکن کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ چاروں طرف بے کراں خاموشی تھی۔ اس نے دوبارہ کچھ سننے کی کوشش کی لیکن ہر طرف مکمل سکوت طاری تھا۔ اُسے محسوس ہوا وہ بالکل تنہا ہے۔

(ترجمہ محمود ایاز)

سید قاسم محمود

موت کی خوشبو!

تین دن اور تین رات سے مسلسل موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ اور یہ تیسری رات تھی۔ جب لوگوں نے اذانیں دی تھیں اور اپنے گناہوں کی معافیاں مانگی تھیں۔ بادلوں نے گرجنا بند کر دیا تھا۔ بجلیاں زمین پر کوئی نیا حادثہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے عاجز آگئی تھیں گھنگھور گھٹا کی چھاؤنی اٹھ چکی تھی۔ لیکن اب بھی ننھی ننھی آخری بوندیں کسی دردناک کہانی کے انجام کی طرح پُر سکون شور مچا رہی تھیں۔ رات کے کوئی نو بجے ہوں گے۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ وہ دونوں بھائی مزدوری کر کے واپس آ رہے تھے۔ اُن کے جوتے جب کیچڑ میں دھنس کر باہر نکلتے تھے تو اُن سے وہی قدیم ترین آوازیں پیدا ہوتی تھیں جو زندگی کی ابتدائی مٹی کو پانی میں گوندھتے وقت معمارِ اعظم کے پیروں سے نکلی ہوں گی۔

پانی سے لبالب بھرے ہوئے گندے نالے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے جب وہ شیخ صاحب کی کوٹھی کے پاس آئے تو اُنھوں نے ایک گڑھے میں کوئی چیز تیرتی ہوئی دیکھی۔ کوٹھی کے سامنے کھڑے ہوئے کھمبے کی روشنی گڑھے کی اس چیز کو نمایاں کر رہی تھی۔ دونوں بھائیوں کی مٹی میں تین چوتھائی پانی تھا۔ وہ بے جھجک گڑھے میں اُتر گئے۔ بڑا بھائی گڑھے کی دوسری طرف سے نیچے اترا۔ اِدھر سے چھوٹا بھائی لنگوٹ کس کر گھٹنوں گھٹنوں پانی تک پہنچا ہی تھا کہ اُس کا پاؤں پھسل گیا۔ سنبھل کر اُٹھا تو بھائی سے پوچھنے لگا "کدھر ہے بھیا"؟ اُدھر سے بڑے بھائی نے جواب دیا "اِدھر آ جا اِدھر"۔ چھوٹا گڑھے کے کنارے کنارے اتھلے پانی میں بڑھتا ہوا بڑے کے پاس پہنچا۔ وہ اُس چیز کو پکڑ کر اپنی پوری طاقت سے باہر کی طرف کھینچ رہا تھا۔ چھوٹے نے اُس کا ہاتھ پکڑا لیکن گیلی گیلی پھسلواں مٹی درمیان میں آ گئی۔ بڑے کے ہاتھ سے وہ چیز

چھوٹ گئی۔ کپڑے کی ایک لمبی سی دھجی اُس کے ہاتھ میں لٹکی رہ گئی۔ وہ چیز پانی میں ڈبکی لگا کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اُس چھونے سے گڑھے کا پانی اُس بڑی بدرو کے پانی سے ملا ہوا تھا جو آگے جا کر اُس گندے نالے سے جا ملتی تھی۔ جو آگے جا کر دریا کے سیلابی پانی سے ملا ہوا تھا۔ جو آگے جا کر سمندر کی گود میں جا گرتا تھا۔ پانی مٹی سے بہت طاقتور ہوتا ہے ہر کہیں پہنچ جاتا ہے۔ پانی سمندر بن کر بڑے بڑے جہازوں اور بیڑوں کو ہضم کر کے اتھاہ گہرائی کے گھناؤنے معدے میں تحلیل کرتا ہے اور بادل کا بھیس بدل کر آسمان کی بلندیوں میں اڑتا پھرتا ہے۔ پانی چاہے تو برف کا خوبصورت گالا بن جائے اور چاہے تو زندگی کو ننگا کر دے اور چاہے تو اُسے چمکدار ہڈی بنا کر سمندر کے کنارے پر پھینک دے۔ لیکن اب دو بھائیوں نے زندگی کے ایک ہڈی دار ہونے کو بچانے کے لئے خود پانی کی ناقابلِ تسخیر طاقت کے چھکے چھڑا رکھے تھے۔ اُن کے چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ بدرو کا پانی، گندے نالے کا پانی، گڑھے کا پانی سڑک پر چھپکتا ہوا پانی۔ آسمان سے برستا ہوا پانی۔ کپڑوں اور بالوں سے نچڑتا ہوا پانی۔ قدموں کے نیچے سے پھسلتا ہوا پانی...... پانی جو زندگی کا باپ ہے۔ (اور تمام عناصر کی ماں ہے) مٹی کے دو پتلوں سے جنگ آزمائی کر رہا تھا۔ لیکن اُن کے چار پیروں نے پانی میں ایک ایسی ہلچل مچا دی تھی کہ آخر اُس نے تنگ آ کر وہ چیز واپس اپنی سطح کے اوپر پھینک دی۔ دونوں بھائیوں نے لپک کر اُسے پکڑ لیا۔ ایک نے ٹانگیں پکڑیں۔ دوسرے نے ہاتھ اور سر اور سینہ تھام لیا۔ باہر نکل کر انہوں نے وہ چیز گڑھے کے کنارے رکھ دی۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ آج سے دس کھرب سال پہلے زندگی تری سے نکل کر خشکی پر آئی تھی۔ لیکن آج جب زندگی دس کھرب سال بعد دوبارہ ساحل پر آئی تھی۔ تو وہ مردہ تھی۔

دونوں بھائیوں نے موت کا مجسمہ اُٹھا کر شیخ صاحب کی کوٹھی کے آگے کھمبے کے نیچے رکھ دیا۔ دونوں نے بڑی کوشش کے بعد اُس کی بوشرٹ اتاری جو لمحہ بہ لمحہ پھولتے ہوئے جسم کے ساتھ ساتھ برابر پھٹتی رہی تھی۔ بوشرٹ کی جیب سے سگریٹ کی ڈبیا اور کالج کا شناخت نامہ برآمد ہوا۔ شناخت نامے کے تمام حروف، مرحوم کا نام اُس کے باپ کا نام۔ کالج کے نام اور پرنسپل کی جامنی مہر کے نقوش پانی نے چاٹ لئے تھے۔ تصویر کا کاغذ انگلیوں کی ہلکی

ہلکی ہمدردانہ حرکات کی تاب نہ لاسکا۔ اور انگلیوں کے میل کی طرح بتیاں بن بن کر جزو آب ہو گیا۔ سگریٹوں کا کاغذ پھول گیا تھا۔ اور اُدھر جسم کے تمباکو کی پتیاں بکھر گئی تھیں۔ کاربن۔ نائٹروجن ہائیڈروجن اور آکسیجن اب بھی اپنی اپنی جگہ زندہ تھے۔ لیکن اُن کا مجموعی نظام بلبلے کی خالی کوکھ کی طرح کھوکھلا ہو گیا تھا۔ گاڑھا گاڑھا خون ناک اور منہ سے نکل کر اُس کے چہرے پر یوں جم گیا تھا جیسے تازہ تازہ گندہ بیروزہ۔ کندھوں۔ کہنیوں۔ رانوں اور پنڈلیوں پر گہرے گہرے زخموں کے لال لال سفید سفید نشان تھے۔ اُس کا جسم پھول کر ہاتھی کے جسم کی طرح مٹیالا۔ بھربھرا اور شکن دار ہو گیا تھا۔ گوشت دبے سے گندھے ہوئے آٹے کی طرح خمیرے رہا تھا۔ کہ انگلی لگاؤ تو دھنستی چلی جائے۔ اُس کی نیم وا مردہ آنکھوں میں پھیلے ہوئے باسی آلوؤں کی سی گلی گلی پیلاہٹ تھی۔ حتیٰ کہ کھوپڑی کا حلقہ بھی پھیل کر بڑا ہو گیا تھا۔ اور چپکی ہوئی سفید ہڈی پر پانی میں بھیگے ہوئے لمبے لمبے بال یوں پڑے تھے جیسے بھٹے کی گردن پر چپکے ہوئے ملائم بال۔ موت کے تعفن کی عکسی لہریں اُس مجسمے سے نکل نکل کر دور دور تک پہنچ رہی تھیں۔

اب سوال یہ درپیش تھا کہ یہ ناقابلِ شناخت۔ خوفناک اور متعفن چیز کس کی ہے۔؟ اُس کا مالک کون ہے؟ کون ہے جو اُسے شناخت کرے؟ اُس کے ارد گرد کھڑے ہوئے پوپے ہجوم بے پناہ میں سے ایک زندگی بھی ایسی نہیں تھی۔ جو اِس موت کی اپنائیت کا دم بھرتی۔ چند ہی منٹوں کے بعد لوگوں کا ایک ہجوم وہاں جمع ہو گیا تھا۔ شیخ صاحب بھی اپنے داماد کے ساتھ باہر نکل آئے تھے۔ ایک اخبار کا رپورٹر اطمینان سے کھڑا تھا۔ خبر کی سُرخی اُس کے دماغ میں مکمل ہو چکی تھی۔ لیکن ابھی تک خبر اپنے انجام کو پہنچنے کے باوجود مکمل نہ ہوئی تھی۔ ایک افسانہ نگار بھی موجود تھا۔ جس کے ذہن میں افسانے کا ملبہ جمع ہو گیا تھا۔ لیکن وہ بنیادی نکتہ جس پر اُسے اپنے افسانہ کی بنیاد رکھنی تھی۔ ابھی تک اُس کے تصوراتنے کوسوں دور تھا۔ بڑی بڑی مونچھوں والا پولیس انسپکٹر بھی دو سپاہیوں کو ہمراہ لے کر وہاں آگیا تھا۔ اور دونوں مزدور بھائیوں کا بیان قلمبند کر رہا تھا۔ کوئی بیس پچیس زندگیاں اُس غیر مرئی دائرے کے کناروں پر کھڑی ہوئی تھیں جس کا نقطہ ایک موت تھی۔ اور اُس نقطے سے تعفن کی نصف قطری لہریں باہر نکل نکل کر دائرے

کے محیط تک پہنچ رہی تھیں۔ ہر نئی زندگی جو رات کے اندھیرے میں ننھی منی آخری بوندیں اپنے اوپر لیتے ہوئے وہاں آتی تھی۔ اُس دائرے کے کنارے پر کھڑی ہو جاتی تھی۔ اور منہ پر رومال یا ہاتھ رکھ لیتی تھی۔ "اِنا للہ و انا الیہ راجعون" کا اعلان کر کے نئی ساتھ والی زندگی سے پوچھتی "یہ کون ہے بیچارا؟" اُس کا جواب فقط یہ ہوتا "پتا نہیں کون ہے"۔ ایک بوڑھی زندگی نے جس کے چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں، انسپکٹر پولیس سے با آواز بلند کہا "سنتری جی! اسے جلدی سے دفنا دینا چاہیئے۔ ورنہ جسم پھٹ جائیگا۔" ایک کہتا تھا "جوان معلوم ہوتا ہے"۔ دوسرا اپنی زندگی کا ثبوت تیسرے کی آواز میں ڈھونڈتا تھا "ہاں جی! بیچارے نے اپنی طرف سے تو بہت ہاتھ پاؤں مارے"۔ وہاں کھڑی ہوئی ہر زندگی بار بار تھوک کر سچ مچ کا اظہارِ افسوس کر رہی تھی۔ کوئی بھی ایسا نہ تھا جو نعش کا گھناؤنا حلقہ چیر کر اُس کے پاس پہنچتا۔ کوئی بھی ایسا نہ تھا جو یہ کہتا کہ ہاں میں اسے جانتا ہوں۔ اسے میں نے وہاں فلاں گلی میں فلاں بازار میں ہنستے کھیلتے دیکھا ہے۔ یہ فلاں کا بیٹا اور فلاں کا بھائی ہے۔ ہر شخص کی روح موت کے المناک احساس سے بوجھل ہونے کے باوجود اس تسلی بخش احساس سے بھری ہوئی تھی: "شکر ہے مرا وہ ہے، میں نہیں"۔ ہر نئے آنے والا شخص دور ہی سے اُسے شناخت کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اُس کا حلیہ پہچان کر تصور ہی تصور میں اُن تمام صورتوں کو یاد کرتا تھا جو اُس نے آج تک دیکھی تھیں لیکن آخر میں بس اتنا کہہ کر رہ جاتا تھا۔ "پتا نہیں کون ہے بے چارا"۔ زندگی اپنے آپکو ہمیشہ ہمیشہ زندہ رکھنے کے لالچ سے موت کو پہچاننے سے انکار کر رہی تھی۔

پھر ایک ایسی زندگی وہاں آئی جس کا جوان بیٹا تین دن اور تین راتوں سے گم تھا۔ وہ تین دن اور تین راتوں سے پاگلوں کی طرح ننگے پاؤں ننگے سر شہر کی سڑکوں، گلیوں، کوچوں اور کھیتوں میں دوڑ رہا تھا۔ گیلے کپڑے اُس کے بدن سے چپکے ہوئے تھے۔ اُس کی ڈاڑھی سے ٹپکتے ہوئے پانی کے قطرے بارش کی ننھی ننھی بوندوں میں جذب ہو رہے تھے۔ ہجوم کو چیر کر وہ آگے بڑھا۔ لاش تک پہنچا۔ اُسے غور سے دیکھا۔ دیر تک دیکھتا رہا۔ اچھی طرح پہچان لینے کے بعد اُس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور اپنے آپ سے کہا "یہ میرا نہیں ہے"۔ پھر وہ مڑ کر اور متعفن دائرے کو پھلانگ کر گندے نالے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ گیا۔

پھر ایک ادھیڑ عمر کی زندگی سفید برقع پہنے وہاں آ ئی۔ اُس کا بھی اکلوتا جوان بیٹا تین دن اور تین رات سے گُم تھا۔ وہ دیر تک متعفن دائرے کے گرد گرد گھومتی رہی۔ اچک اچک کر دیکھتی لیکن موت کا چہرہ اُسے صاف نظر نہ آتا۔ آخر انسپکٹر پولیس کے پاس سے نکل کر وہ آگے بڑھی۔ پھر تو وہ آگے ہی آگے بڑھتی چلی گئی۔ ہجوم کی آنکھیں اُس زندگی پر لگی ہوئی تھیں جس نے نسوانیت کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ وہ موت کے مجسمے کے پاس جاکر بیٹھ گئی۔ بڑے اطمینان سے اُس نے برقع کے گیلے پلو سے اُس کے چہرے کا منجمد خون صاف کیا اُس کے بھیگے ہوئے لمبے لمبے بالوں کا پانی نچوڑا۔ اُس کے منہ سے عجیب عجیب ناقابلِ فہم بالوں کی ناقابلِ سماعت آوازیں آرہی تھیں۔ اُس کے دونوں ہاتھ موت کے سینے پر بڑی ہمدردی سے پھر رہے تھے! ور اُس کے دونوں زندہ ہونٹ موت کا رخسار چوم رہے تھے۔ زندگی موت کی خوشبو سونگھ رہی تھی ــــ اور اس حیات افروز خوشبو کی پھیلتی ہوئی عکسی لہریں متعفن دائرے سے پار دُور تک پہنچ رہی تھیں۔

ضمیرالدین احمد

پیگا گانا

"..... اس سے اچھا تو یہ ہے کہ ڈونسنگ اسکول کھول لے۔ اور نہیں تو کیا۔ اجیسے
بیکالے رکھا ہے۔ ڈانس سکھانے کا۔ میں کہتی ہوں یہ آثار اچھے نہیں۔"
"لیکن اس میں برائی کیا ہے۔ مجھے تو اس میں کوئی عیب نظر نہیں آتا۔"
"تمہیں کیوں نظر آنے لگا۔ تمہاری آنکھوں پر تو......"
"پردے پڑ گئے ہیں! ہے نا! اور تمہاری عقل پر پتھر کہ جب سوچتی ہو الٹا سوچتی ہو۔"
"ہنہہ! میں تو تمہارے بھلے کی کہتی ہوں۔ بدنامی ہوگی تمہاری۔ ناک کٹے گی تو تمہاری۔"
"اور تمہاری نہیں؟"
"میری کیوں کٹنے لگی۔ لڑکی تمہاری ہے یا میری؟"
"شبو ایسی لڑکی نہیں۔ تم تو خواہ مخواہ ——"
"ایسی لڑکیوں کے سر پر کیا سینگ ہوتے ہیں۔ جوان ہے۔ عمر نکلی جارہی ہے۔ جو کچھ
گزر گئے ہے تھوڑا ہے۔ میں کہتی ہوں سر پر ہاتھ رکھ کر رو دوگے۔"
"تم تو ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا دیتی ہو۔"
"اسی کا تو رونا ہے کہ تمہاری لاڈلی بیٹی کی ہر بات ذرا سی معلوم ہوتی ہے۔ کمرے کا
دروازہ بند ہے۔ ریڈیو گرام بج رہا ہے۔ کیا ہو رہا ہے؟ ڈانس سکھایا جا رہا ہے کسے؟ ایک
صاحب کو۔ پہلے کبھی نہ شکل دیکھی نہ نام سنا۔ ننھی بچی ہے نا۔ جس نے انگلی پکڑ لی اس کے ساتھ
ہو لی۔ اور پھر نہ کسی سے پوچھا نہ گچھا۔ کسی سے اجازت مانگی۔"
"اجازت مانگتی تو تم انکار کر دیتیں؟"

"اور تم ہاں کہہ دیتے؟"

"مگر مَیں کہتا ہوں شبو بچہ تو نہیں۔ اپنا بُرا بھلا سوچ سکتی ہے۔ اور ملے چلیگی نہیں تو
کیا ساری عمر یہیں بیٹھی رہے گی۔

موا پیا اندھا کون ہو گا۔ نہ شکل نہ صورت"

"آخر تم کیوں اس کے راستے کا روڑا بنتی ہو۔ نہیں میکا تو نہ سہی"

"مَیں کیوں بننے لگی اس کے راستے کا روڑا۔ اس کا جو جی چاہے کرے۔ تم جانو ا
تمہاری بیٹی۔ مَیں تو جب پوچھونگی جب کچھ کر کے دھر لیگی۔ اور یہ کتاب اب بند کرو۔

"کیوں؟"

"مجھے نیند آرہی ہے"

"اور تم؟"

"مَیں ابھی پڑھوں گا"

"پڑھنا۔ پڑھنا۔ پڑھنا۔ دِن رات پڑھنا۔ ہنہہ!"

مائی ڈیر بجی

خط کا جواب دینے میں ذرا دیر ہوئی تو ناراض ہو گئیں۔ شکایتوں کا دفتر کھول کر بیٹھ
گئیں۔ مَیں نے تو پہلے ہی معافی مانگ لی تھی۔ جانتی تھی کہ میری بجی بڑی تنگ مزاج ہے
ذرا سی بات پر روٹھ جاتی ہے۔ اور پھر منانے کا نام نہیں لیتی۔ اچھا بھئی ایک بار پھر
ایکے سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتی ہوں۔ ہاں تمہاری آپا تم سے معافی مانگ رہی ہے۔
کیا اُسے معاف نہیں کرو گی؟ کیا اپنی آپا سے اتنی خفا ہو۔

مشغولیت تھیں۔ اسے کاہلی کہہ سکتی ہو۔ ادھر کچھ عرصے سے کاہلی مجھ پر اس بُری طرح
سے چھائی ہے کہ جتنا میں اپنے پروگراموں کا دائرہ تنگ کرتی جاتی ہوں اتنا ہی میری کاہلی
مشغولیت کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ گھنٹے گذر جاتے ہیں کہ مَیں کچھ نہیں کرتی مگر پھر بھی
مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ تمام گھنٹے مَیں نے پہاڑ کاٹنے میں گذارے ہیں۔۔۔۔۔۔

یہی تو موسم ہے یہاں آنے کا۔ اِس بار آنا ملتوی نہ کرنا۔ ورنہ ایسا موسم پھر کبھی
دیکھنے کو نہ ملیگا۔ تمہارا خیال غلط ہے۔ امسال یہاں گرمی تو پڑی ہی نہیں۔ عجیب موسم ہے
ہیں گھنٹے کالے دلدار بادل گھیرے رہتے ہیں۔ نہ گرجتے ہیں نہ برستے ہیں۔ ہر وقت
ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چلا کرتے ہیں۔ سچ کہتی ہوں ایسا موسم پھر کبھی نہ پاؤ گی۔ جتنی جلدی
ہوسکے آجاؤ۔ تم بہت یاد آتی ہو۔ ڈیڈی بھی تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔
حقی سے ملے عرصہ ہوگیا۔ اب گھر پر بھی نہیں آتا۔ نہ جانے کیوں کتراتا ہے۔ سُنا ہے
اُن کی شادی ہورہی ہے۔ خان بہادر کی لڑکی سے۔
اِن کا نام نعیم ہے۔ قریب قریب روز آتے ہیں۔ میں انہیں ڈانس سکھا رہی ہوں۔
کافی سیکھ گئے ہیں۔ سچ کہتی ہوں بجی۔ میں نے اتنی جلدی ڈانس سیکھتے آج تک کسی کو نہیں
دیکھا۔ تین چار دن میں فاکس ٹراٹ سیکھ لیا۔ تم یقین نہیں کرو گی۔ سلو والٹز وہ اب
مجھ سے بھی اچھا کر لیتے ہیں۔ انہیں سلو والٹز پسند بھی بہت ہے۔
ممی کو زکام ہوگیا تھا۔ مگر اب ٹھیک ہیں۔ اِن سے تمہارے آنے کا ذکر کیا تھا کچھ بولیں نہیں
تمہاری شبّو"

"تمہارے سر قسم کی چاچا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔"
"جا بے! ۔ تیری بات کو کون یقین کرے۔"
"قرآن اٹھوالو چاچا۔ جو جھوٹ نکل جائے۔ تو جو چور کی سزا سو میری"
"جان کیو لگام دے چھو کرے۔ کیوں ناحک ایسی باتوں میں پاک کتاب کو لاوے
ہے۔ شرم نہیں آئی تجھے!"
"پھر میں جو کہہ رہا ہوں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ادر تم ہو کہ ماننے ہی نہیں۔
اُلٹا مجھی کو جھوٹا ٹھیراتے ہو۔"
"اچھا یہ بول تو نے دیکھا کیسے۔"
"میں ادھر جارہا تھا۔ شبو بی بی کے کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ بس جھلک نظر

آگموئے"

"پر انگریجی ڈانس تو ایسے ہی ہوتے ہے۔ یہ کوئی اپنا ہندوستانی ناچ تھوڑے
ہے کہ دور ہی دور سے۔ یہ تو ولائتی ناچ ہے۔"

"نہیں چاچا میں جو کہہ رہا ہوں کہ میں نے اسے شبو بی بی کی چمی لیتے دیکھا۔ تمہارے
سر کی قسم چاچا۔"

"دھیرے بول۔ کسی نے سن لیا تو سامت آجائیگی۔"

"فکر نہ کرو۔ فون باجا جو بج رہا ہے۔"

"ارے یہ بھنڈ بازی کاٹ رہا ہے کہ چل۔ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر نہیں تو بیگم صاحب
ایسی کھبر لیں گی کہ بس۔ ہاں تو تو نے اپنی آنکھوں سے دیکھا؟"

"تمہارے سر کی قسم چاچا۔ اپنی آنکھوں سے میں تو جھٹ وہیں سبز جھول پردے میں
گیا۔ ایسے سٹے ہوئے تھے ایک دوسرے سے۔ بس پوچھو مت چاچا۔ کیا سین تھا۔"

"پر یہ بول کہ بیگم صاب کو کیسے کھبر ہو گئی۔"

"اپن کو نہیں معلوم۔ پر انہیں خبر ہوئی ضرور۔"

"نہیں بے۔ مجھے تو یوں جان پڑے ہے کہ بجی بی بی جو آئی ہیں نا۔ تو انہی کی کھاطر
یہ انتجام ہوا ہے۔ دونوں بہنیں پہلے بھی اس گھر سے میں رہ چکی تھیں وہ تو جب سے بجی بی بی کی
ساوی ہوئی ہے تب سے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ پر میں نے خود سنا۔ تمہارے سر کی قسم اپنے کانوں سے سنا۔ بیگم
صاحب شبو بی بی سے کہہ رہی تھیں دوپہر کو ہال کمرہ خالی رہتا ہے تو وہیں بیٹھا کرو!"

"یونہی کہہ دیا ہوگا۔"

"ارے چاچا۔ تم نہیں جانتے بیگم صاب کو۔ بڑی چلتی پرزہ ہیں۔"

"اور سنو لونڈے کی باتیں! میں بیگم صاب کو نہیں جانوں ہوں۔ لے جب شبو بی بی
کی والدہ جنت سدھاریں اس سے پہلے سے ہوں صاب کے پاس۔ اللہ جنت نصیب کرے۔
بڑی نیک بی بی تھیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے چاچا پر میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ میں نے کتنی بار بیگم صاحب کو شبو بی بی کی ٹوہ لیتے دیکھا۔ وہ دروازہ بند کر کے سمجھتی ہوں گی کہ چھپی ہوئی۔ پر بیگم صاحب کو ہر بات کی خبر رہتی ہے۔ میری مانو چاچا۔ بیگم صاحب نے ضرور اسی لئے ہال کمرے کی واسطے کہا ہوگا۔"

"یوں بھی ہو سکتا ہے۔ اور نجی بی بی کے آنے میں تو ابھی کئی روز باقی ہیں۔"

"یہی تو میں بھی کہہ رہا تھا کہ اس ہال کمرے والے معاملے میں کچھ گڑبڑ گھٹالا ضرور ہے۔"

ڈیڈی آج بڑا مزہ رہا۔ جانتے ہیں کیا ہوا؟ .... اوہنہ! ایسے تھوڑی بتاؤنگی۔ اچھا گیس کیجئے ... اوہنہ ... نہیں ... غلط ..... اچھا میں بتاتی ہوں آج ممی نے بھی نعیم کے ساتھ ڈانس کیا۔ نہیں، انہیں ڈانس سکھایا۔ میں انہیں رمبا سکھا رہی تھی کہ ممی آگئیں ..... میرے کمرے میں نہیں ہال کمرے میں ..... اُفوہ! آپ میری بات تو سنتے ہی نہیں۔ کہہ جو دیا کہ ہم لوگ آجکل ہال کمرے میں ڈانس کرتے ہیں ..... اُفوہ! کتنے سوال کرتے ہیں آپ۔ اس لئے کہ ممی نے کہا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ دوپہر کو ہال کمرہ خالی رہتا ہے۔ ہاں تو ممی آگئیں۔ پہلے تو کچھ دیر دیکھتی رہیں۔ پھر آپ ہی بولیں تمہیں رمبا خود نہیں آتا سکھاؤگی کیا۔ اور پھر انہوں نے کہا۔ لاؤ میں سکھاتی ہوں۔ میں تو خود سوچتی تھی کہ ممی سے کہوں کہ وہ نعیم کو رمبا سکھا دیں مگر ڈر لگتا تھا کہ کہیں انکار نہ کر دیں۔ بس اسی وجہ سے نہیں کہا۔ اور لو! ممی نے خود آفر کر دیا۔ آپ جانتے ہیں! پورے پچاس منٹ سکھایا۔ ممی نے۔ ممی کو رمبا بہت اچھا آتا ہے ..... آپ ہنسی بہت اڑاتے ہیں۔ میں جھوٹ نہیں کہہ رہی۔ ممی رمبا بہت اچھا کرتی ہیں۔ سچ! اور ممی نے آپ ہی آپ یہ بھی وعدہ کر لیا کہ وہ انہیں روز رمبا سکھایا کریں گی۔ اور پھر بعد میں گانا بھی ہوا ..... پھر انہیں نعیم کا۔ سچ کہتی ہوں ڈیڈی بہت اچھا گاتے ہیں۔ آواز بالکل سہگل سے ملتی ہے۔ بڑا درد ہے ان کی آواز میں ..... نہیں۔ انہیں نہیں پسند آیا۔ ممی کو تو سوائے پکے گانے کے اور کچھ پسند آتا ہی نہیں۔ اور فلمی گانوں سے تو انہیں نہ جانے کیوں نفرت ہے ....

اُفوہ! آپ پھر کتاب میں کھو گئے۔ میری بات نہیں سنتے ...... سچ ڈیڈی۔ بال
سنگل کی آواز ہے۔ اُنھوں نے وہ گانا بھی گایا ..... ہاں! ٹھنڈی ہوائیں لہرا کے آئیں۔
آپکو تو بہت پسند ہے نا یہ گانا ..... انہیں تو فلمی گانوں سے چڑ سی ہے۔ سبھی فلمی
گانے تھوڑی برے ہوتے ہیں ..... یہی تو میں کہتی ہوں۔ اور آواز بھی تو کوئی چیز ہے
سچ ڈیڈی! اچھا کل ہی سنواؤں گی۔ آپ خود اندازہ لگائیے گا۔ کیا آواز ہے!..

میں بستر پر لیٹی ہوئی ایک کتاب پڑھ رہی تھی۔ پڑھ کیا رہی تھی۔ بس یونہی ورق
گردانی کر رہی تھی۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس لئے کتاب اٹھالی تھی۔ ویسے تو میں جلد سونے
کی عادی ہوں۔ مگر اس رات نہ جانے کیوں پپوٹے بھاری ہونے کا نام نہیں لے رہے تھے
حالانکہ سارا گھر سنسان پڑا تھا۔ شور و غل کا ذکر کیا سرگوشیاں تک معدوم تھیں۔ گھر
میں صرف ڈیڈی تھے۔ سو وہ شام سے اپنی لائبریری میں گھسے ہوئے تھے۔ کھانے کے
بعد مجھ سے دو ایک اِدھر اُدھر کی باتیں کیں۔ پھر پائپ سلگایا اور چلے گئے۔ گھر میں اور
کوئی نہیں تھا۔ شبو آپا اور ممی باہر گئی ہوئی تھیں۔ نعیم صاحب کی روزہ کشائی جو تھی
ممی بھی کبھی بڑے مزے کی بات کہہ دیتی ہیں۔ روزہ کشائی! ان کا مطلب تھا نعیم صاحب
پہلی مرتبہ بال روم میں ڈانس کریں گے۔ کئی روز پہلے سے پروگرام بن چکا تھا۔ شبو
آپا مصر تھیں کہ میں بھی چلوں مگر میں نے تو صاف انکار کر دیا۔ اول تو مجھے ڈانس سے
کوئی خاص لگاؤ نہیں۔ اور دوسرے میں یہ نہیں چاہتی تھی کہ میری موجودگی سے ان کی
میرا مطلب ہے شبو آپا اور نعیم صاحب کی ایوننگ میں کسی قسم کی کمی رہ جائے۔ سچ تو
یہ ہے کہ ممی کا ان لوگوں کے ساتھ جانا بھی میری سمجھ میں نہیں۔ مگر شبو آپا شاید ممی کی موجودگی
ضروری سمجھتی تھیں۔ معلوم نہیں ممی خود پروگرام میں شامل ہو گئی تھیں یا شبو آپا نے اصرار
کیا تھا۔ مگر مجھے اتنا معلوم ہے کہ شبو کو کسی قسم کا اعتراض ہرگز نہ تھا۔

تو اسی وجہ سے گھر میں سناٹا تھا۔ نوکر بھی کھانا کھا کر سو چکے تھے۔ ممی وغیرہ
پروگرام میں رات کا کھانا شامل تھا تو نوکروں کو شاید رت جگا کرنا پڑتا۔ کیونکہ و

لوگ جلدی لو ٹنے والے تھوڑی تھے۔

اور اسی وجہ سے مجھے قدرے تعجب ہوا جب اچانک دروازہ کھلا اور شبو آپا کمرے میں داخل ہوئیں۔ میری نظر یں اِن کے چہرے کا جائزہ لینے سے پہلے خود بخود گھڑی کی طرف اٹھ گئیں۔ ابھی تو دس بھی نہیں بجے تھے۔ بہت سے سوالات میرے دماغ میں بھیڑ کرنے لگے۔

"بڑی جلدی آگئیں آپ؟"

آپا نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ مجھے اِن کی خاموشی کچھ غیر معمولی لگی۔ سرگوشیاں کرتی ہوئی سی۔ وہ ابھی تک دروازے کے پاس کھڑی ہوئی تھیں۔

"ممی نہیں آئیں؟"

"نہیں۔"

جواب دیکر وہ دو ایک قدم چلیں۔ میز کے پاس آئیں۔ اور اس پر اپنا سرخ بٹوہ رکھ کر پھر ساکت کھڑی ہوگئیں۔

میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دو ایک سوال میری زبان تک آ کر رک گئے۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر لیمپ کے شیڈ کو اتنا ترچھا کر دیا کہ روشنی شبو آپا کے چہرے پر پڑنے لگی

میرا کلیجہ دھک سے ہوگیا

شبو آپا نے جھٹ سے منہ پھیر لیا۔

"لائٹ آف کر دو بجی"

"میں نے فوراً بیڈ سوئچ دبا دیا۔

وہ جا کر سڑک پر کھلنے والی کھڑکی کے پاس کھڑی ہوگئیں۔ مگر میری نظر اِن کے چہرے پر بھرپور پڑ چکی تھی۔ اور میں نے اِن کی بھیگی پلکیں۔ اِن کے ہلدی جیسے پیلے گال اور اِن گالوں پر آنسوؤں کے نشان تو دیکھ ہی لیے تھے۔

"میں بھی جا کر کھڑکی کے پاس کھڑی ہوگئی۔

"کیا بات ہے آپا؟ تم رو کیوں رہی ہو!"

مگر انہوں نے جواب نہیں دیا۔

"ممی کہاں ہیں؟"

"مجھے کیا معلوم"

"تم کیوں رو رہی ہو؟"

وہ پھر چپ ہو گئیں۔ اور میری پریشانی میں اضافہ ہونے لگا۔

"آخر ہوا کیا؟"

"جواب ندارد"

"شبو آپا ممی سو برائیوں کی ایک برائی یہ ہے کہ اگر چپ سادھ لیں گی۔ تو پھر کوئی کچھ ہی کیوں نہ کر دے وہ زبان نہ ہلائیں گی۔ ایک تو ویسے ہی کم گو ہیں۔ باتیں کرنے کا دورہ تو ان پر سال چھے مہینے میں ایک آدھ بار ہی پڑتا ہے۔ اِدھر کچھ دنوں سے [illegible] ہنسنے بولنے لگی ہیں۔ ہشاش بشاش نظر آتی ہیں۔ جیسے تپتی ہوئی زمین پر برسات کا چھینٹا پڑ گیا۔ ورنہ ان کا کام تو بسا اوقات ہوں ہاں سے چلتا ہے۔ جیسے سُن میری رہی ہوں اور سوچ کچھ اور رہی ہوں۔ عرصہ ہو گیا۔ کھڑی کھڑی سی رہتی ہیں۔ اور یہ [illegible] مرض دائمی بھی نہیں۔ کوئی پانچ چھے سال پرانا ہو گا۔

آخر میں نے پوچھ ہی ڈالا۔

"اور نعیم صاحب؟"

یا اللہ! اِن کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ میری وحشت چیخنے چلانے پر تل گئی اور کئی وسوسے میرے دماغ کو ٹہوکے دینے لگے۔

لو! وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ اور پھوار موسلا دھار بارش میں تبدیل ہو گئی۔ جی تو کچھ اور چاہ رہا تھا۔ مگر میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں بستر کی طرف کھینچنے پر اکتفا کی۔ اور وہ کھینچی چلی آئیں۔ بستر تک۔ جیسے اِن میں جان ہی نہ تھی۔ جو ذرا سی مزاحمت بھی کرتیں۔

انہیں بستر پہ بٹھا کر میں نے اپنا دوپٹہ انکی آنکھوں میں ٹھونس دیا۔ پھر وہ [illegible] بلبلانے کی کوشش میں ہچکیاں بھرنے لگیں۔ اُف وہ! کتنی خوشبو آ رہی تھی! اِن کے کپڑوں سے

مگر معاملہ ابھی صاف نہیں ہوا تھا۔ اور مَیں نے جیسے قسم کھائی تھی کہ اُسے صاف کر کے دم لونگی۔

"اور نعیم صاحب؟"

وہی چپ۔ مگر اِس بار آنسو نہیں ٹپکے۔

"آپا مَیں کیا پوچھ رہی ہوں!"

مگر وہ اسی طرح ایک ہاتھ کے سہارے سر جھکائے خاموش بیٹھی رہیں۔ آخر میری وحشت جھلاہٹ بن کر پھٹ پڑی۔

"سن رہی ہو کہ نہیں!"

اِن کی خاموشی ہی اِن کا جواب تھا۔

مَیں نے ہمت ہار دی۔ زیادہ استفسار بیکار تھا۔ مَیں سمجھ گئی کہ آپا بتائیگی ضرور مگر اِس وقت نہیں چپ ہو گئیں تو بس چپ ہو گئیں اب تو جب یہ چپ ٹوٹے گی تبھی کچھ معلوم ہوگا۔

"آپ لیٹ جائیے"۔ مَیں نے اِن کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

اڑا اڑا دھم۔ جیسے ریت کے گھروندے کو ٹھیس لگ گئی۔ جہاں بیٹھی تھیں وہیں ڈھیر ہو گئیں۔ مَیں نے تکیہ اٹھا کر اِن کے سر کے نیچے رکھدیا۔ اور خود اِن کے پاس بیٹھ گئی۔ آنکھیں بند تھیں مگر وہ جاگ رہی تھیں۔ بڑی شدت سے بیدار تھیں۔

مَیں بہت دیر اِن کے پاس بیٹھی نہ جانے کیا کیا سوچتی رہی۔ ماضی۔ حال۔ مستقبل۔ کل آج۔ کل کے چکر لگاتی رہی۔ اِدھر سے اُدھر۔ اُدھر سے اِدھر دوڑتی رہی۔ حتیٰ کہ میرے ذہن میں بھنبھناہٹ ہونے لگی۔ جیسے میرا ذہن شہد کی مکھیوں کا چھتہ ہو۔ یہ بھنبھناہٹ تیز اور بلند ہوتی گئی۔ یہانتک کہ مَیں گھبرا کر بستر پر سے اٹھی اور جا کر کھلی ہوئی کھڑکی کے پاس کھڑی ہو گئی۔

آسمان پر بادل تھے۔ زمین پر اندھیرا تھا۔ فضا میں خاموشی تھی۔ سڑک سنسان تھی رات کافی گذر چکی تھی۔

میرے ذہن کے چھتے میں پھر بھنبھناہٹ شروع ہو گئی۔ اور میرا دم لوٹنے لگا۔ جی چاہا کہ سارے کپڑے اتار کر پھینک دوں! اور آپ ہی اپنی بوٹیاں آنا چونے لگوں۔ ایک خیال ادھر سے آتا اور زن سے ادھر نکل جاتا۔ پھر دوسرا۔ پھر تیسرا۔ اور کوئی خیال تو زن سے آتا اور زن سے جاتا۔ بس جم کر کھڑا ہو جاتا۔ اور آنکھیں مٹکا مٹکا کر میرا منہ چڑانے لگتا۔

میں گھبرا کر آپا کے بستر کی طرف جانے والی تھی کہ ایک ..... کار کھڑکی کے نیچے سڑک کے کنارے آکر رکی۔ میں ٹھٹھک گئی۔ میں کار کو تو پہچان گئی۔ مگر اندھیرا ہونے کی وجہ سے کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دو انسانوں کو نہ پہچان سکی۔ وہ ایک دوسرے کے بالکل قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ ذرا سی دیر میں وہ ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔ ایسے چمٹے کہ جدا ہونے کا نام نہ لیتے تھے۔ آخر کار وہ جدا ہو گئے اور میرے پھیپھڑوں نے ایک لمبا سانس خارج کیا۔ پھر کار کا دروازہ کھلا۔ ان میں سے ایک باہر نکلا۔ میں پہچان گئی یہ ممی تھیں۔ دوسرے کا صرف ہاتھ باہر نکلا جواب میں ممی نے اپنا ہاتھ ہلایا۔ کار اسٹارٹ ہوئی اور یہ جا وہ جا۔

میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ شبو آپا اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔

"کون تھا"؟

"ممی!"

میں ان کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔

انہوں نے نظروں کے ذریعہ مجھ سے ایک اور سوال پوچھا۔ میں نے جواب دیا "ہاں"!

اتنے میں زینے پر ممی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میرا سارا بدن تن گیا۔ شبو آپا نے پھر گردن جھکالی تھی۔

قدموں کی چاپ پاس آتی گئی۔ حتیٰ کہ ہمارے کمرے کے سامنے آئی اور آگے نکل گئی۔ ممی ایک فلمی دھن میں کچھ گنگنا رہی تھیں۔ اور کچھ گا رہی تھیں۔ آپا کا محبوب گیت "ٹھنڈی ہوائیں لہرا کے آئیں"

میری مٹھیاں بھنچ گئیں۔

"میں ابھی جا کر ڈیڈی سے کہتی ہوں!"

اور میں نے ایک قدم دروازے کی طرف اٹھا بھی لیا۔

مگر آپا کے برف جیسے ٹھنڈے ہاتھ نے میری کلائی پکڑ لی۔ کتنی طاقت آگئی تھی اس کمزور ہاتھ میں۔ میں ہل بھی نہ سکی۔ پھر اسی کمزور ہاتھ نے میری کلائی کو ایک جھٹکا دیا۔ اور دھڑا دھم! جیسے ریت کے گھروندے کو ٹھیس لگ گئی۔ میں شبو آپا کے پاس بستر پر گر پڑی۔ اور میری جلتی ہوئی آنکھوں میں نمی دوڑ چلی۔

شش ون کمار و دما

گڈو کی کہانی

مَیں ایک کہانی کے پلاٹ کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ساتھ والے کمرے سے چیخنے کی سی آواز آئی۔ "مَیں نہیں جاؤں گا سکول۔"

مَیں سمجھ گیا میرا چھوٹا بھائی نریندر جو پانچویں جماعت کا طالب علم ہے روز کی طرح آج بھی کسی چیز کے لیے ضد کر رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس کا پڑھائی میں دل نہیں لگتا۔ سکول سے روز شکایت آتی ہے کہ وہ پڑھتا نہیں۔ کلاس میں بیٹھا شرارتیں کرتا رہتا ہے۔ کسی کی نب توڑ دی۔ کسی کا قلم گم کر دیا۔ کسی کی کاپی خراب کر دی۔ سکول کا کام کبھی گھر سے کر کے نہیں لے گیا۔ وہیں کسی کی کاپی مانگی اور نقل کر لی۔ اُستاد بلیک بورڈ پر سوال سمجھا رہا ہے! اور یہ جناب سلیٹ پر اُس کی مضحکہ خیز شکلیں بنا بنا کر لڑکوں کو دکھا رہے ہیں۔ سزا ملی تو گھر بھاگ آئے۔ کتابیں سکول ہی رہ گئیں جنہیں ماتا جی نے نوکر کو بھیج کر کتابیں منگائیں۔ اِدھر نریندر نے بچّے کی جیب میں رکھے پیسے ہتھیائے اور سامنے والے میدان میں دندناتا جا پہنچا۔ جب کہو کہ بیٹھ کر پڑھو تو سر میں درد۔ پیٹ میں درد۔ پیاس اور نہ جانے کیا کیا ستانے لگتا۔

پھر وہی آواز آئی۔ "میں نہیں جاؤں گا سکول!"

ماتا جی نے پچکارا۔ "راجہ بیٹا" لے یہ دو آنے خرچ لینا شام کو پکچر دکھانے لے چلیں گے۔"

"نہیں"

"پھر وہی بات"۔ ماتا جی نے بڑے پیار سے کہا۔ میرا اچھا بیٹا۔ مَیں رتن کو ساتھ بھیجتی ہوں وہ ماسٹر سے کہہ دے گا۔ نتّی کو ماریں نہیں۔ جا میرا چندا بیٹا۔"

"پہلے ہمیں ٹکینو لے دو۔"

"سکول سے آکر لے آنا۔"

"نہیں پہلے گلّو لایا ہے۔"

اور ماتا جی اُس کا ہاتھ پکڑے میرے کمرے میں آئیں۔ "ذرا بازار جا کر اُسے کینو لے دو۔"

مجھے نریندر پر پہلے ہی غصہ تھا۔ ماتا جی کا یہ لاڈ اچھا نہیں لگا۔ ہر بات مان کر اسے ضدی بنائے دے رہی ہیں۔ میں کہے بغیر نہ رہ سکا: "ماتا جی، یہ اس طرح بگڑ جائے گا۔ پڑھتا ہے نہیں۔ روز اسی طرح ضد کرنے لگتا ہے۔"

نریندر نے میرا منہ چڑایا۔ "اوو۔ اوو۔"

میں کرسی سے اٹھا کہ ایک آدھ لگا دوں۔ نریندر ماتا جی کی دھوتی پکڑ اُن کے پیچھے جا چھپا۔

ماتا جی نے ہنس کر کہا: "بچہ ہے ابھی بڑا ہو کر سمجھ جائے گا۔" اور اندر چلی گئیں۔ ......

بادلِ ناخواستہ مجھے نریندر کے ساتھ جانا پڑا۔ کینو کے شوق میں وہ سکول سے لیٹ ہو رہا تھا لیکن لئے بغیر مانا نہیں۔ جب ہم بازار سے لوٹ رہے تھے تو گلی کے موڑ پر گڈو [illegible] گیا۔ گڈو نے میلی سی قمیص جس کے بٹن ٹوٹے ہوئے تھے۔ گلے میں جانگیہ پیروں سے ننگا۔ گردن کے پیچھے سے گھوم کر آئی ہوئی ڈوری کے دونوں سروں سے ایک ٹین کی غلیظ سی ٹرے بندھی تھی۔ جیسے وہ دونوں ہاتھو سے تھامے تھا۔ ٹرے میں عموماً آنے آنے کے سستے بسکٹ اور کھٹی میٹھی ولیسی گولیاں وغیرہ پڑی ہوتی تھیں۔ گڈو کی ماں ہمارے گھر برتن مانجھا کرتی تھی۔ اُس کے ساتھ کبھی کبھی گڈو بھی آ جاتا تھا۔ اس طرح وہ نریندر کا واقف ہو گیا تھا۔ بعد میں ہم نے نوکر رکھ لیا۔ گڈو کی ماں بھی بیلے بیچنے لگی تھی۔ نریندر کو دیکھ کر وہ مسکرایا۔

نریندر نے خوش ہو کر اُسے بتایا: "گڈو میں نے کینو لی ہے۔"

گڈو کو معلوم نہیں تھا کینو کیا ہوتی ہے۔ وہ حسرت بھری نگاہوں سے نریندر کے ہاتھ میں پکڑے گتے کے ڈبے پر بنی رنگین تصویریں دیکھنے لگا۔ پھر اُس نے شاید تصویروں سے اندازہ لگا کر پوچھا: "اس کا سامان بنتا ہے؟"

"بہت سی چیزیں بنتی ہیں۔ شام کو گھر آ جانا دکھاؤں گا۔"

گڈو "بسکٹ، میٹھی گولیاں" پکارتا ہوا بازار کی طرف چلا گیا۔

نریندر نے میری طرف دیکھ کر پوچھا: "بھیا، گڈو کی ماں اُسے سکول کیوں نہیں بھیجتی؟"

"مجھے کیا معلوم۔" مَیں نے قدرے تلخی سے کہا۔ میرا دھیان نرِیندر کے سکول سے لیٹ ہو جانے کی طرف تھا۔ لیکن وہ اُس کا بظاہر معمولی سا سوال میرے جواب سے جیسے مطمئن نہیں ہوا تھا۔ میرے دماغ میں اِس طرح پھڑ پھڑانے لگا جیسے بند کمرے میں کبوتر۔ اور مَیں سوچنے لگا۔ واقعی۔ گڈو۔ سکول کیوں نہیں جاتا۔ جب نرِیندر سکول جاتا ہے۔ ڈاکٹر کھنہ اور مہرہ سلک ملز کے مسٹر کپور اور بینک منیجر مسٹر سوری کے بچے سکول جاتے ہیں تو یہ گڈو کیوں نہیں جاتا۔ یہ ننگے پیر، پھٹی قمیص پہنے صبح صبح مرمرا وغیرہ بیچنے کیوں جاتا ہے؟"

شام کو مَیں اپنے کمرے میں بیٹھا پڑھ رہا تھا کہ مجھے کسی کے جالی کے دروازے سے جھانکنے کا احساس ہوا۔ مَیں نے کتاب سے نظریں ہٹا کر اُدھر دیکھا۔ جالی سے آنکھیں لگائے گڈو اندر جھانک رہا تھا۔ اُس نے آہستہ سے پوچھا۔ "بابوجی نَنو ہے؟"

اُسے دیکھ کر وہ کبوتر پھر میرے ذہن میں پھڑ پھڑانے لگا۔ مَیں نے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

"آ جاؤ اندر۔"

وہ سہما ہوا سے اندر آ گیا۔ حقیقت میں وہ ماتا جی سے ڈرتا تھا۔ وہ اُسے عموماً جھڑک دیا کرتی تھیں۔ "کہاں ہے نَنو؟" اُس نے پوچھا۔

مَیں جانتا تھا وہ کبھی اُوپر نہیں جائے گا۔ اس نے نرِیندر کو آواز دے کر نیچے آنے کو کہہ دیا جب تک نرِیندر نہ آیا وہ ڈیک میں رکھی میری کتابوں کو غور سے دیکھتا رہا۔ وہ کبھی میری طرف دیکھ لیتا۔ کبھی کتابوں کو چھُو لیتا۔ اُس نے حیران سی نظروں سے مجھے دیکھا۔ جیسے مَیں کوئی دنیا سے علیحدہ کی چیز ہوں۔ پھر ڈری ہوئی سی آواز میں پوچھا۔ "بابوجی، تم اتی بڑی بڑی کتابیں پڑھ لیتے ہو؟" اس کی آواز میں حیرانی اور حسرت کے ملے جلے جذبات کی گونج تھی۔

مَیں مسکرا دیا۔

اتنے میں نرِیندر مکینو لے کر آ گیا اور اُنہوں نے میرے کمرے میں ہی فرش پر اپنا چھوٹا سا کارخانہ کھول دیا۔ نرِیندر بیچ بیچ میں مجھ سے پوچھتا جاتا تھا۔ مَیں اُنہیں سمجھا دیتا۔ گڈو نہایت انہماک سے ہر بات سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ماتا جی کسی کام سے وہاں آ گئیں۔ گڈو کو اِس طرح نرِیندر کے ساتھ جڑ کر

بیٹھے دیکھ کر اُن کی بھنویں تن گئیں۔ "ذرا دور ہٹ کر بیٹھ۔ اُس کے کپڑے بھی خراب کریگا"
میرے دِل میں جیسے چھُری اُتر گئی۔ لیکن مَیں کچھ کہہ نہ سکا۔
گڈو تھوڑا دور ہٹ گیا۔ اُس نے ہاتھ کے بٹن کے ٹکڑے جنہیں جوڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک طرف رکھ دئیے اور نریندر کو جوتے دیکھنے لگا۔ لمحہ بھر پہلے اُس کے چہرے پر جو بشاشت ناچ رہی تھی۔ ایکدم غائب ہو گئی۔ اُس کی جگہ خوف اور پشیمانی کی پرچھائیاں پھیل گئیں۔
ماتا جی نے پھر سختی سے کہا۔ "نتی اسی طرح تیری چیزیں گم ہو جاتی ہیں۔ مَیں دوبارہ نہیں منگا کر دوں گی۔ چل سنبھال کر رکھ لے۔"
ماتا جی نے گڈو کو چور کہہ دیا تھا۔ مَیں گڈو کو بلا کر خود کو مجرم محسوس کرنے لگا۔
"مَیں نہیں۔" نتی اڑ گیا۔
مجھے پہلی مرتبہ نتی کی ضد پر بے پناہ مسرت کا احساس ہوا۔
ماتا جی نے دوسرا وار کیا۔ "گڈو جا تیری ماں آوازیں دیتی ہوگی۔"
گڈو شینی حرکت سے اُٹھا اور گردن لٹکائے آہستہ آہستہ چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔
میرا دل بے اختیار رو دینے کو چاہا۔
ماتا جی نے مجھے سمجھانے کے سے انداز میں کہا۔ "تم تو سمجھدار ہو، جانتے نہیں اُس کی ماں کو دِق ہے اور وہ خود بھی کتنا گندا رہتا ہے۔ نہ پیر میں جوتی نہ بدن پر ڈھنگ کے کپڑے۔ میرا تو اُسے دیکھ کر جی متلانے لگتا ہے۔ نتی ایسوں کے ساتھ بیٹھ کر ہی تو خراب ہوتا ہے۔ یہ نہ خود پڑھتے ہیں نہ اوروں کو پڑھنے دیتے ہیں۔ دوسرے کی ترقی دیکھ کر جلتے ہیں۔"
گڈو دس سال کا بچہ کیا حسد کرے گا۔ وہ تو کھیلنے آ گیا تھا۔ لیکن ماتا جی کو کون سمجھاتا مَیں خاموش رہا۔
پھر کئی دِن گڈو ہمارے ہاں نہیں آیا۔ ویسے بازار میں مَیں اُسے روز ہی دیکھتا تھا۔ میری طرف دیکھ کر مسکرا دیتا۔ مَیں نے ایک دن اُس سے یونہی پوچھ لیا۔ "گڈو تم سکول کیوں نہیں جاتے۔؟"
اُس نے ہنس کر بتایا۔ "گھر کا کام کون کرے۔ اور" وہ شاید اپنی اُس چھوٹی سی

دوکانداری کے بارے میں کچھ کہتا کہ ایک لڑکا کچھ خریدنے آگیا۔ اور وہ اُس کی طرف متوجہ ہوگئے

ایک شام میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ پتا جی آ گئے۔ "کہاں ہے ننّی کا رزلٹ کارڈ"

میں نے رزلٹ کارڈ دے دیا۔

دیکھا اور کارڈ میز پر پھینک کر بولے۔ "کیا فائدہ ہے تمہارا گھر میں پڑھے لکھے ہونے کا۔ پانچویں جماعت کے بچے کو نہیں پڑھا سکتے۔ ہر مضمون میں فیل ہے۔"

"یہ پڑھتا ہی نہیں کسی وقت۔ ماسٹر الگ شکایت کرتے ہیں کہ جماعت میں بیٹھا شرارتیں کرتا رہتا ہے۔" میں نے بتایا۔

"جی ہاں آپ کبھی یہی کہیں گے۔" پتا جی نے طنزاً کہا۔ "یہ کیوں نہیں کہتے کہ پڑھا نہیں سکتے۔ بچہ شرارتی نہ ہو تو کیا بوڑھا ہوگا۔ اتنا ذہین لڑکا ہے، ذرا راستے پر لانے کی ضرورت ہے۔ تھوڑی سی محنت کی جائے تو یہ پڑھ جائے گا۔"

"ایسے تو کتاب دیکھتے ہی سر درد ہونے لگتا ہے یہ پڑھ چکا۔" میں نے کہا

"بس تمہیں بھی باتیں بنانا آگئی ہیں۔ کبھی بیٹھ کر گھنٹہ دو گھنٹے پڑھایا بھی ہے۔" نہ پڑھاؤں تو کیا آوارہ گردی کراؤں۔ بڑا ہو کر برتن مانجھے گا! ابھی بچہ ہے دل نہیں لگتا پڑھائی میں بڑا ہو کر سنبھل جائے گا۔ آدمی کچھ بھی نہ کرے تو بھی تعلیم بہت ضروری ہے۔" اور انہوں نے اسی وقت نریندر کو حکم دیا کہ انگریزی کی کتاب لے کر میرے پاس پہنچ جائے۔

وقت پر اسے کبھی کتاب ملتی ہی نہ تھی۔ پندرہ بیس منٹ بعد وہ آیا۔ میں اسے پڑھانے لگا۔ وہ کتاب پر نظریں نہ جما کر کبھی دیوار پر ٹنگے کلینڈر کی طرف، کبھی شیلف پر رکھے تاج محل کی طرف دیکھنے لگتا۔ میں نے اسے ڈانٹا اور توجہ سے پڑھنے کے لئے کہا۔ بی۔ یو۔ ٹی بٹ۔ سی۔ یو۔ ٹی۔ کٹ۔ پی۔ یو۔ ٹی۔ پٹ۔

ننّی اڑ گیا۔ "نہیں بیٹے۔

"ایسے پُٹ ہی بولتے ہیں۔" میں نے بتایا۔

"کیوں؟"

"کیوں کا بچہ!

ای۔ای۔ای۔ وہ میرا منہ چڑا کر بھاگ گیا۔

ماتاجی اُسے پیچھے کر آئیں۔ بسر پر ہاتھ پھیرا۔ پیار کیا اور ہاتھ میں چونی دے کر کہا۔ "پڑھ لکھ کر [illegible] ہو جا۔ پھر تجھے ولایت بھیج دیں گے۔"

"میں نہیں پڑھتا بھیا سے، مجھے ماسٹر لگا دو۔" اُس نے اعلان کیا۔

"اچھا لگا دیں گے۔ اِس وقت تو پڑھ لے۔" ماتاجی نے اُسے راضی کیا۔ وہ فاتحانہ نظروں سے [illegible] میری طرف دیکھ کر پڑھنے کے لئے تیار ہو گیا۔ میں پڑھا رہا تھا کہ جالی کے پیچھے گڈو کا چہرہ نمودار ہوا۔ میں نے ادھر دیکھا تو وہ پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے دروازہ کھول کر اُسے اندر بلا لیا۔ وہ ڈر رہا تھا۔ "ماتاجی تو نہیں ہیں؟" اُس نے پوچھا۔

"نہیں۔" کہہ کر میں نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

یہ دیکھ کر گڈو کو قدرے اطمینان ہوا اور وہ نریندر کے ساتھ کھڑا ہو کر کتاب دیکھنے لگا۔ "تم انگریزی بھی پڑھ لیتے ہو؟" اُس نے سوال کیا۔

"ضرور۔" گڈو نے غرور سے جواب دیا۔

میں نے پیار سے گڈو سے پوچھا: "پڑھ ہو گے؟"

اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں انگریزی کے الفاظ کے ہجے اور معنی بتانے لگا۔ وہ دونوں دہرانے لگے۔ چند الفاظ پڑھا کر میں نے ان کا امتحان لیا۔ "نریندر کائٹ کے ہجے کرو اور معنی بتاؤ۔"

وہ کلنڈر کی طرف دیکھنے لگا۔ "مجھے نہیں آتے۔" اُس نے بے نیازی سے کہا۔

"میں بتاؤں۔" گڈو بولا۔

"بتاؤ۔"

اور اُس نے صحیح جواب دیا۔ میرے ہر سوال کا وہ صحیح جواب دیتا رہا۔

"گڈو تو لکھ بھی لیتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کا کھا۔ لکھ لیتا ہوں۔ اے بی سی نہیں آتی۔" اُس نے جیسے شرم محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا میں تجھے خوش خطی کی کاپی لا دوں گا۔ مشق کیا کرنا۔"

وہ خوش ہوگیا۔ پڑھاتے پڑھاتے مَیں نے پوچھا: "تو سکول کیوں نہیں جاتا؟"

"باپو نہیں بھیجتا۔"

"اچھا مَیں کہوں گا تیرے باپو سے۔"

"جرور کہنا۔" اُس کا چہرہ کھِل اُٹھا۔ "باؤجی، کہو گے نا؟"

اُس کے منہ سے اپنے لئے لفظ "باؤجی" سن کر مجھے خواہ مخواہ احساسِ شرمندگی ہونے لگا۔
مَیں نے اُسے سمجھایا: "گڈّو تو مجھے باؤجی مت کہا کر۔ نِتّی کی طرح بھیا کہا کر۔"

وہ مسکرایا۔

مَیں نے کہہ تو دیا تھا کہ اُس کے باپو سے کہوں گا۔ لیکن بات کرنے کا موقعہ ہی نہیں مل سکا۔ حالانکہ وہ ہمارے ہی محلّے میں رہتا تھا۔ اور ہمارے مکان کے نزدیک ہی۔ ہمارے مکان سے تین چار مکان چھوڑ کر ایک خستہ حال پرانی حویلی کی آخری نشانی ایک تنگ تاریک کوٹھری میں وہ لوگ رہتے تھے۔ گڈّو کا باپ دفتی کاغذ کے کھلونے اور غبارے وغیرہ بیچا کرتا تھا۔ وہ صبح نکل جاتا اور رات کو لوٹتا۔ مَیں اُس سے مل ہی نہیں سکا۔

ایک صبح مَیں حجّام کی دوکان سے لوٹ رہا تھا کہ گڈّو کی کوٹھری سے اُس کے رونے اور اُس کے باپ کے مارنے اور گالیاں دینے کی آواز سنائی دی۔ مَیں نے جھانک کر دیکھا۔ گڈّو کا باپ اُسے مار رہا تھا۔ مجھے بہت دکھ ہوا۔ یہ دیکھ کر اور بے اختیار مَیں اُسے بچانے کی غرض سے اندر داخل ہو گیا۔ کوٹھری میں دھواں بھرا ہوا تھا۔ ایک دروازے کو چھوڑ کر جس سے مَیں داخل ہوا تھا۔ اس کوٹھری میں نہ کوئی کھڑکی تھی نہ روشن دان۔ دھوئیں اور سیلن کی بو کوٹھری میں رچی ہوئی تھی۔ جس میں دم گھٹا جاتا تھا۔ ایک دیوار سے دوسری دیوار تک ایک رسی بندھی ہوئی تھی۔ جس پر چند میلے کپڑے لٹک رہے تھے۔ ایک کونے میں چند پیتل کے برتن اور ایک مٹی کا گھڑا رکھا تھا۔ دوسرے کونے میں دیوار کے ساتھ ایک چارپائی بچھی تھی۔ جس پر میلا سا بستر بچھا تھا۔ اور گڈّو کی ماں چادر گلے تک اوڑھے لیٹی تھی۔ دھوئیں اور بیماری کی وجہ سے وہ بار بار کھانس رہی تھی۔ اُس کے سرہانے طاق میں مٹی کی کُپّی جل رہی تھی شعلے کے اوپر دیوار کا کچھ حصہ سیاہ ہو چکا تھا۔

"اب بس بھی کرو کون سی چوری کی ہے اُس نے۔" گڈّو کی ماں نے کہا اور اُسے کھانسی کا دورہ

پڑ گیا۔

مَیں نے آگے بڑھ کر گڈو کے باپ کا اٹھا ہوا ہاتھ پکڑا۔ "بچّہ ہے کیوں مارے جاتے ہو؟"

"بابُو جی تم اُسے بگاڑ دو گے" اُس نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔

میں ہکا بکا رہ گیا۔

وہ پھر بولا۔ "تم نے اسے کاپی لا دی ہے۔ یہ سب کچھ بھول کر اسی میں لگا رہتا ہے۔ ماں اس کی بیمار ہے۔ اب میں باہر جاؤں یا گھر کا کام کروں۔ ہم نے پڑھا کر لکھا کر کیا لیا ہے۔ یہ کون لاٹ صاحب بنے گا۔ نہ پڑھے گا تو کیا بگڑ جائے گا۔ میں نہیں پڑھا تو کیا روٹی نہیں کماتا۔ لیکن اس ڈھیٹ کو کچھ لگتی ہی نہیں۔ جو دو چار آنے کماتا ہے اُس سے بھی جائے گا۔ بتاؤ گھر کا خرچ کیسے چلے گا۔!"

مَیں دل میں تعلیم کے فوائد پر ایک نہایت ٹھوس، موثر اور مدلل لیکچر سوچے بیٹھا تھا کہ گڈو کے باپ سے مل کر اُسے تعلیم کے فوائد کا قائل کروں گا لیکن اُس کے چند الفاظ نے جیسے میری کل قوتِ گویائی سلب کر دی۔ مَیں گردن لٹکائے واپس آ گیا۔

دوپہر کو مجھے گڈو بازار میں سودا بیچتا مل گیا۔ مجھے دیکھ کر مسکرا دیا مَیں نے پیار سے اُسے سمجھایا کہ گھر کا کام بھی کرتا ہے اور پڑھنے بھی آتا رہے۔ دل نہ چھوڑے۔

وہ وقت نکال کر روز شام کو آنے لگا۔ بچہ ذہین تھا۔ جو مَیں پڑھاتا جھٹ سمجھ جاتا۔ اُسے پڑھا کر سچ پوچھئے تو مجھے بھی لطف آ جاتا تھا۔ مَیں نے اُسے ہندی اور انگریزی کی پہلی کتابیں ختم کرا دیں۔ اُسے تختی وغیرہ بھی لے دی تھی جو وہ روز لکھ کر مجھے دکھاتا۔

ایک دوپہر میں اُس کی کوٹھری کے سامنے سے گزرا تو دیکھا وہ بڑے انہماک سے تختی دھو کر اُس پر گاچنی مل رہا ہے اور گنگنا رہا ہے۔ "ٹنک ٹنک پٹنے" مجھے دیکھ کر وہ مسکرا دیا۔ "بھیّا مَیں نے سارے سوال نکال لئے ہیں۔ سب ٹھیک ہیں۔"

"شاباش۔" کہہ کر میں آگے بڑھ آیا۔ گھر پہنچا تو دیکھا کہ ننّی بچّی کی زنجیر پکڑے اُسے بسکٹ کھلا رہا ہے اور نوکر اُس کی تختی دھو رہا ہے۔

شام کو گڈو وقت پر کتاب تختی وغیرہ لے کر آ پہنچا۔ ننّی ابھی تک اُوپر سے نہیں اُتری تھا۔ وہ اپنی کتابیں ڈھونڈ رہا تھا۔ آخر نوکر سے بستہ اور تختی اُٹھوائے وہ اس شان سے آیا جیسے میلہ

دیکھنے جا رہا ہو۔ نئی مسکن زین کی سفید نکر نیلے رنگ کی سلکی ٹی شرٹ، پیروں میں باٹا کے نئے جوتے اور نائلون کی جرابیں پہنے جیسے وہ پڑھنے نہیں شادی پر آیا ہو۔ کرسی پر بیٹھ کر اس نے گڈو کو جوتے دکھا کر کہا: "میں نے نئے جوتے لئے ہیں۔ گیارہ روپے پندرہ آنے کے۔"

گڈو نے حسرت بھری نگاہوں سے نتی کو دیکھ کر اپنے گندے لباس کی طرف دیکھا اور اپنے ننگے پیروں پر نظریں گاڑیں جو ٹخنوں تک کیچڑ اور دھول میں اٹے پڑے تھے۔

میں اس کے ننھے سے دل میں کروٹیں لیتے احساس کمتری کو محسوس کر رہا تھا۔ میں نے پیار سے کہا: "گڈو میں تجھے بھی بوٹ اور نکر قمیص لا دوں گا۔"

اس نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ اس دن وہ بہت اداس رہا۔ لیکن پڑھنے میں پوری توجہ سے کام لیا۔ کوئی غلطی نہیں کی۔ دوسرے دن میں نے اسے نتی کی دو پرانی نکریں، دو قمیص اور پرانے جوتے دے دئے۔ ماتا جی کا خیال تھا کہ ان چیزوں کے عوض وہ اچار کے لئے مرتبان لیں گی۔ لیکن دان پن کے فوائد بتا کر میں نے انہیں راضی کر لیا۔ شام کو جب گڈو آیا تو اس نے ہاتھ منہ دھو رکھا تھا اور نئے کپڑے پہنے تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ داد طلب انداز میں مسکرایا۔ میں نے ہنس کر اسے بتایا کہ وہ بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ وہ بازار میں بھی صاف ستھرے کپڑے پہن کر جاتا۔ باپ سے بچا کر وہ بازار سے دو آنے کی بوٹ پالش کی ڈبیہ لے آیا۔ ہر اتوار کو وہ اپنے کپڑے دھوتا۔ بوٹ پالش کرتا۔ گھر کا کام کرتے وقت وہ میلے کپڑے پہن لیتا۔ لیکن چند دنوں کے بعد یکایک گڈو نے آنا بند کر دیا۔ بازار میں بھی کبھی نظر نہیں آیا۔ ایک دن اتفاقاً دھنا مل گیا۔ میں نے اس سے گڈو کے بارے میں پوچھا: "گڈو نظر نہیں آیا ان دنوں؟"

"ایک دکان پر نوکر کرا دیا ہے باؤ جی۔ آٹھ روپئے مہینہ مل جاتا ہے۔ کام سیکھ جائے گا۔"

"دکان سے لوٹتا کس وقت ہے؟"

"رات کو دس بجے۔"

"اور صبح جاتا کتنے بجے ہے؟"

"یہی کوئی ساڑھے سات بجے۔"

"بچہ ہے اتنا کام کرے گا تو صحت خراب ہو جائیگی۔" میں نے کہا۔

وحشنے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سر لٹکا لیا۔

ایک دن مجھے گڈو بازار میں مل گیا۔ میں نے اُس سے کہا: "تم پڑھنے کیوں نہیں آتے؟"

"دکان پر دیر ہو جاتی ہے۔" وہ بولا

"رات کو آجایا کرو۔" میں نے رائے دی۔

"نیند آنے لگتی ہے۔"

میں چلا آیا۔ اُن دنوں مجھے ننّی کو پڑھا کر لطف نہیں آتا تھا۔ وہ کتابوں سے دور بھاگتا تھا۔ ایک شام میں اُسے پڑھا رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ پھر آواز آئی۔ "باؤجی۔"

میں نے اُدھر دیکھا۔ گڈو تختی بستہ لئے کھڑا تھا۔ میں اسے اِس وقت دیکھ کر حیران رہ گیا دروازہ کھول کر اندر بلا لیا۔ "کیسے آگئے گڈو؟"

"نوکری چھٹ گئی۔" اُس نے بتایا۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"لالہ نے نکال دیا۔"

"کیوں" کیا ہوا تھا؟"

وہ چپ رہا اور ریک میں رکھی کتابیں دیکھنے لگا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ "میں یہ کتابیں کتنی دیر میں پڑھ لوں گا۔!"

میں اس سوال کا جواب دے سکا! اس لئے نہیں کہ اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ یا سوال مہمل تھا۔ بلکہ اس لئے کہ میں اِس سوال کے پیچھے چھپی خواہش اور جذبہ کی گہرائیوں میں ڈوب گیا تھا۔

دوسرے دن جب گڈو کا باپ ملا تو میں نے پوچھا۔ "وحشنے اب گڈو دوکان پر نہیں جاتا؟"

"باؤجی ایسا نالائق لڑکا میں نے نہیں دیکھا۔" اُس نے کہا۔

"بات کیا ہوئی آخر؟"

"اتنا نیک مالک تھا پر اِس نے جو انہیں سوچا۔ پوچھو تو دوکان پر کام کرنے جاتا ہے یا پڑھنے وہاں جا کر کتاب لے بیٹھتا۔ اِس نے کام کے پیسے دیئے ہیں۔ آرام کے نہیں۔ اُس نے مجھ سے کہا۔ میں نے کتاب لے کر رکھ لی۔ اِس نے وہاں ردّی سے کتابیں ڈھونڈ کر پڑھنا شروع کر دیں۔ مالک نے

نے تنگ آ کر نکال دیا۔ آٹھ روپیہ مہینہ تو گیا۔"

میں حیرت زدہ اُس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ آخر میں نے کہا: "تعلیم کیا اتنی بری چیز ہے۔"

"اچھی بُری کی بات نہیں باؤجی۔ سب ہی تو نہیں پڑھتے۔ میں نہیں پڑھا۔ میرا باپ نہیں پڑھا۔ یہ پڑھ کر گورنر بن جائے گا۔ یہ تو امیر آدمیوں کے شوق ہیں۔ غریب نے تو پیٹ پالنا ہے محنت مزدوری کر کے۔ پھر شروع سے کیوں نہ کرے۔"

گڈو آتا رہا۔ وہ بڑے ذوق و شوق سے پڑھ رہا تھا۔ اور اگر باقاعدہ سکول جانے لگتا یقیناً امتیازی درجہ سے پاس ہوتا رہتا۔ اچانک اُس نے آنا پھر بند کر دیا۔ میں نے دھنے سے پوچھا اُس نے بتایا کہ اس مرتبہ گڈو کو کسی چائے والے کی دوکان پر نوکر کرا دیا تھا۔ میں نے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ نبی کے سکول سے رپورٹ آئی کہ وہ اس سال پاس نہیں ہو سکے گا۔ پتا جی مینجنگ کمیٹی کے صدر سے ملے سکول کو سو روپیہ دان دیا۔ ماسٹر کا انتظام کر دیا۔ اور ہر سال کی طرح نبی کا پاس ہو جانا یقینی ہو گیا۔

کل کا ذکر ہے میرے ایک دوست نے مجھے ایک دعوت نامہ دیا کہ اگر فرصت ہو تو شام کو ٹاون ہال میں صوبے کے وزیرِ تعلیم کا لیکچر سن آؤں۔ جو وہ شہر کے پڑھے لکھے طبقے یا بقول اُس کے فیکٹری کی ایک میٹنگ میں دینے والے تھے مجھے بھی شام کہیں گزارنا تھی۔ وقت کم رہ گیا تھا اس لئے اپنے دھیان میں تیز تیز قدم اٹھاتا چلا جا رہا تھا کہ کسی نے آواز دی۔ "باؤجی"۔

میں نے رک کر دیکھا۔ گڈو کھڑا مسکرا رہا تھا۔ "گڈو تو؟" میں نے اُسے غور سے دیکھا کپڑے گندے، جوتے کیچڑ میں لت پت اُس کے ہاتھ میں چائے کی کیتلی تھی۔ "گڈو تو نے پڑھنا بالکل چھوڑ دیا"

وہ خاموش رہا۔

دوکان پر بیٹھے چائے والے نے اُسے ماں کی گالی دے کر جلدی آنے کو کہا۔

"پڑھ لیا کر آ کر۔" میں نے پھر کہا۔

"ٹیم نہیں ملتا باؤجی۔" کہتا ہوا وہ دوکان کی طرف چلا گیا۔

نہ جانے کیوں میرا ہاتھ خود بخود کوٹ کی جیب سے وہ دعوتی کارڈ نکال لایا۔ پل بھر میں میں نے اُس چکنے سفید کارڈ پر سنہری حروف میں چھپی عبارت کو پڑھا۔ "آزاد ہندوستان میں تعلیم کیوں ضروری ہے؟"

مجید امجد

ایک صبح

یہ کیا فسوں ہے جوانِ کائنتی شعاعوں نے
دھوئیں میں لتھڑی ہوئی راہ پر انڈیلا ہے
گھنے بنوں کی سیہ فام چوٹیوں کے قریب
حسین روشنیوں کا عجیب میلہ ہے

•

یہ ایک صبح جو سیلِ زماں میں ڈوبی ہے
یہ ایک پل جو مری زندگی سے ابھرا ہے
یہ ایک سانس جو دل کے لبوں کو چوم گئی
اِس ایک سانس کی وسعت کو کون جانتا ہے

•

پھسل پھسل کے خنک دست شاخساروں سے
گری ہے جھوم کے کیف سپردگی کے ساتھ
بہ سطحِ آبِ رواں
اک کرن
کہ میری حیات

اخترالایمان

شکستِ خواب

کون ہو بنتِ مہ و مہرِ درخشاں و نجوم
کس لیے آئی ہو غم خانہ منور کرنے؟
منتظر میں بھی تھا برسوں سے کوئی سیم بدن
نرم مخمل کی طرح، پھول سی، ہلکی ہمہ نور
یوں بڑھے میری طرف جیسے ندی کی لہریں
رات بھر ناچنے والی کی طرح نیند سے چور
ہاتھ پھیلائے کنارے کی طرف بڑھتی ہیں
یوں بڑھے میری طرف جیسے کہیں شہر سے دور
رات کے بطن میں سوئی ہوئی آسودہ کرن
سبزۂ خاک بداماں کی طرف بڑھتی ہے
اور اک آن میں ڈھل جاتے ہیں سب رنج و محن
کون ہو بنتِ مہ و مہرِ درخشاں و نجوم
کس لیے آئی ہو غم خانہ منور کرنے؟
اس کے ہر گوشے کو مہکا دو بنا دو دلہن
تم اسے اپنی محبت سے فروزاں کر دو

بینت کی کرسی، وہ چھپر کے پرانے جونے
جھاڑ کر ان کو ذرا گھر میں چراغاں کر دو

اختر الایمان

چلو چلیں

کوئی جو رہتا ہے رہنے دو مصلحت کا شکار
چلو کہ جشنِ بہاراں منائیں گے سب یار
چلو نکھاریں گے اپنے لہو سے عارضِ گل
یہی ہے رسمِ وفا اور من چلوں کا شعار
جو زندگی میں ہے، وہ زہر ہم ہی پی ڈالیں
چلو ہٹائیں گے پلکوں سے راستوں کے خار
یہاں تو سب ہی ستم دیدہ غم گزیدہ ہیں
کریگا کون بھلا زخم ہائے دل کا شمار
چلو کہ آج رکھی جائیگی نہادِ چمن
چلو کہ آج بہت دوست آئیں گے سردار

اختر انصاری

قطعات

حلاوتِ غم

گردشِ گردونِ گرداں آ چکی ہو جس کو راس
خونِ دل کے ساغروں سے بجھ چکی ہو جس کی پیاس
اُس کے احساسِ حزیں کی شہد آگینی نہ پوچھ
جس نے غم کے سمِ قاتل سے نچوڑی ہو مٹھاس

گریۂ خندہ نما

اپنے ناسوروں میں یوں نشتر چبھونا چھوڑ دے
زہرِ غم کو یوں رگِ جاں میں سمونا چھوڑ دے
آبشارِ اشکِ خوں ہیں صاف تیرے قہقہے!
آہ اختر! میری جاں اس طرح رونا چھوڑ دے

چند لمحے

مدتوں برسیں گے اختر میری آنکھوں سے شرار
آہ میرے زخمِ دل برسوں لہو ٹپکائیں گے
چند لمحے خوں فشاں بھی اور خون آلود بھی
عمر بھر یاد آئیں گے، ہاں عمر بھر یاد آئیں گے

اندوہِ جمیل

بربطِ ضبطِ فغاں کی زمزمہ باری تو دیکھ
اشکِ پنہاں کی نظر افروز گلکاری تو دیکھ
پیار آ جائے تجھے بھی! اے مشیت تو بھی
میرے اندوہِ تمنا کی طرح داری تو دیکھ

شفیق فاطمہ شعریٰ

اے دل! اے دل!!

ے دل تو اک خودرو پھول ہے صحرا کا
وف نہ کھانا اِن پرہول چٹانوں میں
م اِس اجڑی محفل ہی سے نباہیں کے
قص کریں گے مہکیں گے ویرانوں میں

○

ے دل اے دل!! گھل گھل کے یوں خون نہ ہو
م کی آگ میں دھیرے دھیرے پگھلنا چھوڑ
صل گل آئی، کچھ تو کر موسم کی شرم
ود کی صورت شام وسحر اب جلنا چھوڑ

○

دھانی دھانی سبزے میں روشن لالے
لالوں کی پتی پتی شبنم سے تر
ے دل اِس اک پل کی شوبھا میں کھو جا
ے دل اِس اک پل کے بعد کی بات نہ کر

○

اہی پیچھے مڑ مڑ کے کیوں تکتے ہو؟
سوچو کیا اِس گاؤں میں تم رک سکتے ہو؟
انکھوں کی گاگر نہ چھلک جائے دیکھو۔
کیوں رکتے ہو، کیوں بے کار ٹھٹکتے ہو؟

شفیق فاطمہ شعریٰ

خلد آباد کی سرزمین

"خلد آباد، اورنگ آباد سے چند میل کے فاصلے پر ایک بستی ہے جن پہاڑیوں میں ایلورا کے غار ہیں انہیں پر یہ بستی بسی ہوئی ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاؑ نے اپنے جن شاگردوں کو دکن روانہ کیا تھا انکی ایک بڑی تعداد اسی سرزمین میں محوِ خواب ہے۔ کبھی اس جگہ کو دکن کا کشمیر کہتے تھے" (شعریٰ)

کوہساروں کا اودا اودا دھواں نیلے آکاش کا رازداں
خامشی تہہ بہ تہہ موج موج جیسے اک قلزم بے کنا[illegible]

رہگذاروں میں تو ہے مریم اور ہواؤں میں اُمنگوں کا جوش
اِن فضاؤں میں ہے بے نقاب زندگی کا جمال و [illegible]

خلد آباد کی سرزمیں گنبدوں مرقدوں کی امیں!
تیری شاموں میں خوابوں کے رنگ تیری صبحیں جیالوں کے رو[illegible]

تیرے پیڑوں کے سائے تلے کھیلتی ہے ہوائے بہشت
رنگینی سے سجل تیری چھاؤں چاندنی سی حسین تیری د[illegible]

تیری مٹی میں غلطاں نجوم چرخ کے خسروں سے سوا
تیرے چشمے کبھی تشنہ لب لالہ زاروں کے غم خوار تھے

لہلہاتی تھی کشتِ ہنر مسکراتا تھا گلزارِ عشق
کچھ مسافر یہاں خیمہ زن منزلِ بر گھر بار تھے

اُنکی آنکھوں میں تسخیر کا سحر تھا جادوئے مہر تھا
انکے قصرِ سرافراز میں بادشاہی کے انوار تھے

جن کی ہمت نے جب بھی لیا ناز گفتار کا امتحاں
انکے نعرے فضا میں بلند انکے لاشے سرِ دار تھے

دل شکستہ تھے گو خارا شکن راہ میں آشفتہ تھے
خواب میں تھا زمانہ مگر حوصلے انکے بیدار تھے

دیکھا کتنے سورج ہوا اِن پہاڑی کے پیچھے غروب
تم کو لازم تھی آہ و فغاں اور نہیں ڈوبنا تھا ضرور

قیقت کی بستی ہے پائی دھندلی سی اقلیم خواب
دُود نفس جسم پر چھا گیا اور مٹی میں ہوئے رو بظہور

ہر کی زد میں قطار جلتے بجھتے چراغوں کی ہے
گاہ پیچاں ادھر موج دود گاہ جوشاں ادھر سیل نور

یغ تاریخ کی روشنی پربتوں پر بکھرتی ہوئی
تیشہ ہائے پہاڑی کی گونج رقص کرتی ہوئی دور دور

ت تراشوں کی پرچھائیاں منتظر مست رہ دیوانہ وار
پتھروں سے چھلکتا ہوا پیار کا مدھ ہنر کا غرور

اہ پیڑوں کے سائے تلے جلوۂ آگہی کی نمود
بادِ صحرا میں جلتی ہوئی مشعلِ فطرتِ ناصبور

ر نہا قرن گاتا رہا برہمن اپنے شیریں بھجن
نسل ہا نسل بٹتا رہا جامِ غم کا کیف و سرور

ا الہا سال گونجا کیا نغمۂ مصطفےٰ حسن کا سحر
رشکِ آموز زلزالِ صور رشکِ آموز سازِ نشور

لِ توحید کی محفلیں محوِ تاب و تب و درد و داغ
ہر گپھا پر چراغاں کا سماں ہر پہاڑی پہ انوارِ طور

دیپ بالائے مہ و مہر کی جگمگاتی رہی راہ میں
اور کرتے رہے قافلے حدِ آفاق ہستی عبور
راہ پیمائیگاں نشانِ صورِ نکہت و رنگ و نم

ہے رواں مثلِ موجِ نسیم کاروانِ شہور و دہور

محبت تیرے آستاں کو بڑھ نہ جائے زمانے کا سیل
میرے نغمے میں ہو جا مقیم سب کے جد دستر زمیں

میری مینائے آرزو پہ ساغرِ بے سبب ہو
یہ چھلکتی ہوئی زندگی تیرے اسرار کی ہوا ہیں

اس بیاباں کی پرسوز خاک پر مرے ماتھے سے چھٹنے نہ پائے
گھر کے آفتاب میں کھو نہ دو ہاتھ تیرا دامن کہیں

عصر حاضر نے تنہا ہے درِ شہرِ نوردانِ شوق
جن کے نقشِ قدم سے ہی تر و تازہ بادل رشکِ امین ہو

خلد آباد کی سر زمیں چیخ اٹھی ہو کے بے اختیار
چیخ اٹھا ہے بے اختیار اس کے غمگین دل کا

کہہ رہی ہے کہ اے راہرو میری مٹی کو پیہم نہ چوم
اس فضا کی گھٹن بھی تو دیکھ جس فضا میں ہے دبکی کشا

اک جہاں تھا جو گم ہو چکا اک جہاں جو دبیدہ سا ہے
آنکھوں کی دبیز پنہاں جیسے اقلیمِ عاد و ثمود

تو نے دیکھی تو ہو گی یہاں کاروبارِ گدائی کی دھوم
تو نے دیکھا تو ہو گا یہاں نیند میں کاروانِ وجود

غنچۂ نو شگفتہ سے زمزم ہاتھ میں کشکول تھامے ہوئے
خاک و خوں میں تڑپتا ہوا کتنی صبحوں کا رنگِ نمود

ان نظاروں سے میرا دلِ زار داغِ دامانِ عالم بنا
ان نظاروں نے بکھرا دیے میری تقدیس کے تار و پود

لالہ و گل کے رنگین ڈھیر کھو چلے اپنی شیریں مہک
کھو چلے اپنی شیریں مہک صندل و عطر و لوبان و عود

نے بہارِ گذشتہ کے نقش نے نئی فصل کی شان آہ
مدتوں سے ہیں یہاں مردہ دو طائروں کا ورود

کریں دل کے آئے وہ روئی اپنی فریاد یہاں بلند
پھونک دیں صبر کی کشت کو جس کا حاصل زیاں ہو نہ سود

آباد کی سرزمیں! مجھکو فریاد کی خو نہیں

گزرے ہیں روز و شب میری آنکھوں کے آنسو نہیں

امنگوں کا خون ہو چکا ان کا مدفن یہ پہلو نہیں

(جو امنگوں کا اک سیل تھا میرے سینے میں وہ دل تو ہے)

دید کی تشنگی مجھ کو نظارے کی پیاس ہے

جلوے ہوئے گم تو کیا چشم بینا مرے پاس ہے

نظریں ستارہ میں مجھکو نظارے کی آس ہے

(میری نظریں ستارہ میں میری کھیتی کا حاصل تو ہے)

محفل نہیں ہے نہ ہو میں تو ہوں میری محفل تو ہے

محفل کا نور سر میری محفل میں شامل تو ہے

آرزو میری بھرپور ہے میرا اخلاصِ کامل تو ہے

(جو امنگوں کا اک سیل تھا میرے سینے میں وہ دل تو ہے)

تیرے ساگر کی اک اک لہر تیرا آبِ بقا تیرا زہر — تیرا ہر دور مجھ میں ہے گم میری نظروں سے دارا دہر

شاخِ ایجاد سے کونپلیں پھوٹتی بھی ہیں جھڑتی بھی ہیں — سب کے ہونٹوں پہ مٹی کا رس دل میں ارمان

بسملِ آرزو دل وہی میری رہ بھی منزل وہی — آج بھی منتظر ہیں مرے معرکے مجھ پہ در وا کیے

میں منادی کروں گی ترے گنجِ پنہاں کی بازار میں — لے اڑوں گی مثالِ صبا میں ترے عطر کو شہر شہر

آج تک میں جلاتی رہی تیرے در پر مرادوں کے دیپ

آج سے میرے نغمے میں تو اپنی شمعِ مقدر جلا

میری آواز کے سوز میں شعلۂ جاوداں بن کے جل

گھٹ کے ان وادیوں میں نہ رہ حدِ آفاق تک پھیل جا

تیرے رنگِ کہن کے تغیر میں نقشِ عصرِ رواں نا تمام

نقشِ عصرِ رواں کے بغیر تیرا رنگِ کہن بے بقا

جلیل حشمی

بغداد کے بعد

ضیا تاب جھلکتے ہوئے مہتاب سے جسم
جلے مرمر کے تراشیدہ بتوں جیسے
ے پھونکا ہے کسی ساحرِ صد سالہ نے اسم
تا ہو ہر گام پہ اک شہرِ طلسم
بر و عود کی خوشبوؤں کا اُٹھتا طوفان
ن چھناچھن چھنن بجتی ہوئی اشرفیاں
ں بلّور پہ نوخیز کنیزیں رقصاں
بکف دشنۂ برّندہ بہ محرم پنہاں
ف بہ صف آہن و فولاد کے کڑیل پیکر
در برق چمکتے ہوئے مسیقل خنجر
مارت کے شکنجوں میں چٹختے پتھر
لف آلود چٹانوں کے نگوں سار جتنے
کھائے ہوئے چھتنار درختوں کے تنے

یہ پگھلتے ہوئے حبشی یہ سیہ فام غلام
(زندگی اِنکی مرصّع در و دہلیز کے نام!)
یہ چہکتے ہوئے گلشن، یہ سمن پوش حسیں
لالہ رُخ، سیم بدن، مست نظر، زہرہ جبیں
تا اُفق صورتِ امواجِ صبا محوِ خرام
گوشے گوشے سے اُبھرتی ہوئی رنگیں پریاں
تتلیاں پھولوں پہ اُڑتی ہوئی، جگنو پرّاں
یہ چھلکتے ہوئے ساغر، یہ کھنکتے ہوئے جام
یہ بلا نوش یہ مدہوش خراباتِ بدوش
یہ سمن پوش درآغوش غزل خواں خیّام
سازو آواز کے ہر سمت لپکتے شعلے
یہ قباؤں میں نظر تاب بھڑکتے شعلے
ہمہ اقلیم تنفّس میں مہکتے شعلے
کوئی بستی ہے شہرزاد کے افسانوں کی
یا ہے تصویرِ تخیّل کے پری خانوں کی
جیسے یہ رات ہو بغداد کے ایوانوں کی
جانے کب سے مَیں تماشائی ہوں اس عالم کا
جیسے رومان کی وادی میں کوئی شہزادہ

ترش دِل میں ہزاروں لئے پتھرا جائے

د شب ٹکٹکی باندھے ہوئے تکتا جائے

•

کے اِس جشنِ طلسمات کے ہنگاموں سے

گاتی ہوئی اِن ہوش رُبا شاموں سے

ں دیوارِ حرم چھوڑ کے پریوں کے بہشت

ر درباز ندیموں کا جلیبوں کا جلوس

ل کر مسندِ عالی پہ حریری ملبوس

ک آلودہ و صد چاک سی گدڑی اوڑھے

ت بھر شہر کے ویرانوں میں چلنے والا

یرہ گلیوں کے ہر اک موڑ پہ ڈھلنے والا

ے دِلِ زار یہاں کوئی نہیں ۔ کوئی نہیں !!

جلیل حشمی

وقت کا پڑاؤ

سربرآوردہ گھنے پیڑ سرِ راہگذار
ٹہنی ٹہنی پہ لئے تند بگولوں کا غبار
جیسے پتھرا گئے ہوں اسطرح استادہ ہیں
شش جہت پھیلی ہوئی رات کے ویرانے میں
جیسے آفاق سے اُترے ہوں اندھیرِ دل کے رسول
کوئی کونپل کوئی پتا نہ کوئی پھل ہے نہ پھول
چھائے چھائے ہوئے سائے کے سوا کچھ بھی نہیں
جیسے کسریٰ کے محلات کے سنگین ستون
اپنے کندھوں پہ اُٹھائے ہوئے صدیوں کی تھکن
اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے اسرارِ کہن
کسی سوئے ہوئے بغداد کی پر ہول فصیل
جو دروانے پہ یا قصرِ قلوپطرہ کے

ظلمتِ شب کی ردا اوڑھے ہے کھڑی ہو لبِ نیل
کمریں باندھے ہوئے افریقی غلاموں کی قطار
منتظر ہلکی سی تالی کی دبی دستک کی
کسی صندوق کو لہروں میں بہانے کے لئے
عام سی بات کو اک بھید بنانے کے لئے
قاف تا قاف خموشی کا سماں ہے جیسے
سرد آنگن ہو سرِ شام کسی برہمن کا
خواب دیکھے ہوں جوانی کے نہ جس نے پورے
بن کے تصویر خلاؤں میں جو پہروں گھورے
جس کی تقدیر میں ہو شمع کی صورت جلنا
رات ہے یا کسی فرعون کی تاریک جبیں
کھا گئے بڑھ کے ستاروں کو دھوئیں کے بادل
چاند کی کھوج میں نکلے جو چکوروں کی طرح
کھو گئے دھند سے بھرپور فضاؤں میں کہیں
سر چھپائے ہوئے اب پھرتے ہیں چوروں کی طرح

رات کے شہر میں۔ جو نور کے شیدائی تھے

کن سیہ تنگ ڈھلانوں میں ہیں اُجلے تارے

کس دھواں دیتی ہوئی شاخ میں چاند اٹکا ہے

غمِ خورشید میں گھل گھل گئے شب کے مارے

اپنے سینوں سے لگائے ہوئے تو دیتے کنول

گام در گام سرِ راہ بچھے ہیں کانٹے

پھول کو چھوتے ہی دامن میں شرر پالیے ہے

جانے ان پیڑوں کی دیوار کے پیچھے کیا ہے

یہ سیہ رات، گھنے پیڑ، گراں سناٹا

وقت کس اُلجھے ہوئے موڑ پہ آ ٹھہرا ہے

محمود ایاز

"نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کفِ خاک"

ئی بھولی ہوئی صورت، کوئی بسرا ہوا خواب
ب کے سنّاٹے میں کھلنے لگے احساس کے باب
وئی نغمہ! مری خاموش محبت کے رباب
یہ امیدوں کی کشاکش یہ تمناؤں کے جال!

انے کس راہ سے گذری گئی امیدوں کی برات
اصلے بڑھتے گئے شوقِ سبک گام کے ساتھ
سی بول! اے مری محرومی کی بڑھتی ہوئی رات
کتنی دور اور ہے وہ شہرِ طرب خلدِ وصال!

ہاں ڈھونڈوں تجھے اے صورتِ زیبائے خیال
شب کی آغوش میں خوابیدہ ہیں بے نور انجم
شوق کے ہاتھ میں ٹوٹے ہوئے پیمانۂ و خم
آرزو وقت کے پھیلے ہوئے صحراؤں میں گم

ن حجابات میں روپوش ہے اے صبحِ جمال
ایک چوٹ ایک خلشِ ذوقِ تجسس کا مآل!!

محمود سعید

پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال

دشتِ افلاک میں جلتے نہیں تاروں کے دیے
بامِ گردوں پہ کوئی چاند ابھرتا ہی نہیں
شب کی خاموش فضاؤں سے نکل کر کوئی
دل کی اجڑی ہوئی راہوں سے گزرتا ہی نہیں

بھولی بسری ہوئی یادوں کا سہارا لیے
ہر اک آہٹ پہ نظر جانبِ در جاتی ہے
عہدِ رفتہ کے پلٹنے کا گماں ہوتا ہے
بے خودی بزمِ نگاراں کی خبر لاتی ہے

بے کراں رات کے سناٹے میں خود کو کھو کر
جی میں آتا ہے کہ گزرے ہوئے غم یاد کریں
بھول کر سارے زمانے کے گراں بارِ الم
جو محبت میں گوارا تھے ستم یاد کریں

پھر اسی کوچۂ گمنام سے آئی ہے صدا
اس نے گھبرا کے مجھے پھر سے پکارا ہے
اس کی قربت غمِ دوراں کا مداوا نہ سہی
پھر بھی اک درد ملے گا جو گوارا ہوگا

کھو گئی ہے مری فردوسِ طربناک جہاں
پھر اسی انجمنِ ناز میں لے چل اے دل!
اجڑی اجڑی ہی سہی مہر و وفا کی راہیں!
ان کے قدموں کے نشانات ہیں منزل منزل

شاد عارفی

○

بہار کی خبر میں اختمال بھی تو چاہئے
کبھی کبھی اجازتِ سوال بھی تو چاہئے

غزل میں طنز، طنز حسبِ حال بھی تو چاہئے
برائے "شمعِ فکر"، اشتعال بھی تو چاہئے

ہمیں سے ہے سلیقۂ سوال کا مطالبہ
اُنہیں خیالِ حالِ پُر ملال بھی تو چاہئے

وہ بدسلوکیاں کہ جس سے تنگ آ چکے ہیں ہم
نہیں کچھ اُن کی فکر کچھ خیال بھی تو چاہئے

عتاب کی نگاہ سے جھلک رہی ہیں شوخیاں
کسی بھی فن میں ہو مگر کمال بھی تو چاہئے

یہ قربِ خار و گل بھی کوئی سوچنے کی بات ہے
حفاظتِ جمال کو جلال بھی تو چاہیئے

بہونہ یہ اعترافِ جور کی ہیں بجلیاں جہاں
وہاں جبیں یہ ابرِ انفعال بھی تو چاہیئے

انہیں اگر نیا "علاجِ حال" فرض ہے
ہمیں جسارتِ بیان حال بھی تو چاہیئے

یونہی تو باغباں نہیں بنائے گئے ہو تم
گلوں کا رکھ رکھاؤ، دیکھ بھال بھی تو چاہیئے

وہ ہم سے گفتگو کریں وہ ہم سے ماجرا سنیں
جو کہہ رہے ہیں ظلم کی مثال بھی تو چاہیئے

خلوصِ میکدہ میں شاد مجھکو شک نہیں مگر
شراب کیلئے گرہ میں مال بھی تو چاہیئے

○

طوفان ہوائیں لاتی ہیں یا دریا دل مینہ برساتا ہے
آہ کدھر سے اٹھتی ہے یہ اشک کہاں سے آ جاتا ہے

ہم بندۂ حسن و عشق سہی ایسا بھی کوئی وقت آتا ہے
جب حسن سے وحشت ہوتی ہے جب عشق سے جی گھبراتا ہے

کون اپنے پرائے دعووں کا یوں کھوج لگانے جاتا ہے
یہ روگ ہمیں کو راس ہے کچھ یہ شغل ہمیں کو بھاتا ہے

بے شورش و بے آہنگ نہیں دل موجۂ بے مہتاب سہی
سینے میں کوئی آشوب ہے جو ہر سانس میں اُمڈا آتا ہے

پوچھیں جو کوئی غمخوار ملے، سمجھیں جو کوئی بیمار ملے

ہم جس کو غمِ دل کہتے ہیں اِس دیس میں کیا کہلاتا ہے

وہ موسمِ وحشت اور ہی تھا یہ فصلِ بہاراں اور ہی شے

اِس فصل میں خود ہی پائے جنوں زنجیر میں لپٹا جاتا ہے

آنکھوں کے سفینے بیچ سہی کچھ گوہر ڈھونڈ ہی لانے ہیں

غم مایۂ یک عالم ہے مگر پہلو میں سمٹ ہی آتا ہے

وہ رس تو ہوائیں پی بھی گئیں وہ رنگ تو کرنیں چاٹ گئیں

وہ شکل کہاں چھپ جاتی ہے، وہ روپ کہاں کھو جاتا ہے

ساحلؔ یہ جو اک تحریر سی ہے اُس گیت کی تصویر سی ہے

جو گیت کسی دل موجی سے کبھی آواز ملا کر گاتا ہے

شہرت بخاری

○

شہر ہستی ہے خواب سا کوئی | ہم خبر ہے نہ ہم نوا کوئی
رات بھر آسماں کو تکتا ہوں | جیسے تاروں میں جا بسا کوئی
ابدی تیرگی کا جزو ہوا | چاند کے ساتھ جب رہا کوئی
گھر ہی سے نکل سکا نہ کبھی | جس نے پایا ہے راستہ کوئی
کون سورج کو یہ خبر دیتا | شمع کے ساتھ جل بجھا کوئی
ڈوبتی ناؤ کا نظارہ کیا | چڑھتے دریا کو دیکھتا کوئی
اپنی صورت سے خوف کھاتا ہوں | یوں دکھاتا ہے آئینہ کوئی
یہ عجب شہر ہے جہاں یارب | اجنبی ہے نہ آشنا کوئی

ق

ہائے کیا لوگ تھے خیال آرا | جن کا ثانی نہ مل سکا کوئی

کوئی سرو و سمن کو باعثِ رشک　　غیرتِ موجۂ صبا کوئی

کوئی جاڑوں کی چاندنی جیسا　　گرمیوں کی دوپہر سا کوئی

کوئی برسات کی گھٹا کی مثال　　ہمسرِ برقِ طور تھا کوئی

روز یہ منظر تھی شکل نئی　　روز اک داغ دے گیا کوئی

ڈالی ڈالی، کلی کلی گھوما　　یعنی بھنورے کی ذات تھا کوئی

عمرِ رفتہ کا سوگ ہے یہیں ہوں　　دھوپ میں برف رکھ گیا کوئی

ق

بات سچی ہے نیم سے کڑوی　　آدمی ہو کہ ہو خدا کوئی

عشق کی کربلا میں شہرت جی
تم سا کم حوصلہ نہ تھا کوئی

عبدالمجید حیرتؔ
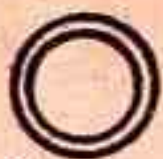
کشیدہ یوں نہ ہو جائے کسی سے — اگر سوچے کوئی سنجیدگی سے

کسی کو ہے اگر کچھ ہم سے شکوہ — ہمیں بھی کچھ شکایت ہے کسی سے

نہ جانے کام کتنے تھے کہ بگڑے — ہمارے عزم و ہمت کی کمی سے

بپا اک فتنۂ محشر ہی دیکھا — خرد مندوں کے علم و آگہی سے

سنا تھا آئے گا اک وقت وہ بھی — اندھیرا کم نہ ہوگا روشنی سے

بہت ہی اب تو دل گھبرا گیا ہے — عزیزانِ وطن کی بے رخی سے

ہمیں اک فیصلہ کرنا ہے یہ بھی — خودی سے کام لیں یا بیخودی سے

کرم ہوگا اگر اربابِ نخوت — ہمیں معذور رکھیں بندگی سے

یہی کچھ قحطِ بادہ ہے تو اک دن — کریں گے رند توبہ میکشی سے

نہ دل سوزی نہ ہمدردانہ جنبش — تو پھر کیا فائدہ اُس دوستی سے

بنا بھی ہے کسی کا کام حیرتؔ
فقط الفاظ کی جادوگری سے

وحید اختر

دیوانوں کو منزل کا پتہ یاد نہیں ہے
جب سے ترا نقشِ کفِ پا یاد نہیں ہے

افسردگیِ عشق کے کھلتے نہیں اسباب
کیا بات بھلا بیٹھے ہیں کیا یاد نہیں ہے

ہم دل زدگاں جیتے ہیں یادوں کے سہارے
ہاں لٹ گئے جس پر وہ ادا یاد نہیں ہے

تھک ہار کے بیٹھے ہیں امیدوں کے بگولے
وہ اک نگہِ قبلہ نما یاد نہیں ہے

گھر اپنا تو بھولی ہی تھی آشفتگیِ دل
خود رفتہ کو اب در بھی ترا یاد نہیں ہے

آوارۂ جادہ نہ ہم آسودۂ منزل
جب سے ترے پائل کی صدا یاد نہیں ہے

آشفتگی، حیراں نظری بے خبری میں
اپنا ہی بھلا اور برا یاد نہیں ہے

بیتے ہیں ترا نام ہی یوں جاگتے سوتے
جیسے کہ ہمیں اپنا خدا یاد نہیں ہے

ہر دامنِ رنگیں ہے پسندیدہ جنوں کو
شاید کہ ترا رنگِ حنا یاد نہیں ہے

ہر چاکِ گریباں سے لپٹ جاتی ہیں نظریں
آنکھوں کو ترا بندِ قبا یاد نہیں ہے

اب حسن کے ہر رنگ کو نسبت ہے تجھی سے
کیا غم جو مجھے تیری ادا یاد نہیں ہے

یہ ایک ہی احسانِ غمِ دوست ہے کیا کم
بے مہریِ دوراں کی جفا یاد نہیں ہے

ہے قرب کے بیتے ہوئے لمحوں کا یہ انعام
ایامِ جدائی کی سزا یاد نہیں ہے

بے برسے گذر جاتے ہیں مدماتے ہوئے بادل
جیسے انہیں میرا ہی پتہ یاد نہیں ہے

پروائی بھی دیوانہ گر اس رت میں نہیں ہے
مجھ کو ترے آنچل کی ہوا یاد نہیں ہے

اس بار وحید آپ کی آنکھیں نہیں برسیں
کیا جھومتی زلفوں کی گھٹا یاد نہیں ہے

وحید اختر

ے یادِ التفاتِ نگاہِ وفا ہنوز
شبنم سے ہے کرن کا وہی سلسلہ ہنوز

نجی ہوئی ہے دل میں وہ آوازِ پا ہنوز
دل کی شکستگی بھی نہیں بے صدا ہنوز

ے تم کہ ساتھ چھوڑ کے میرا چلے گئے
لپٹی ہوئی ہے دامنِ گل سے صبا ہنوز

زردۂ مآلِ محبت نہیں ہوں میں
یادِ ابتدائے عشق کی ہے ہر ادا ہنوز

بِ انتظارِ ساعتِ دیدار بھی نہیں
پھر منتظر ہے کس کا دلِ مبتلا ہنوز

م مجھ سے دور جا کے بھی میرے ہی پاس ہو
دکھلا رہی ہے خواب مجھے چشمِ وا ہنوز

ی نہیں فراغتِ احساسِ ہجر ابھی
محرومیوں کو تم سے نہیں ہے گلہ ہنوز

ئینہ خانہ ہو چکا پتھراؤ میں شہید
ٹوٹا نہیں ہے یاد کا اک آئینہ ہنوز

ت ہوئی ہے موسمِ گل کے وداع کو
نکلی نہیں دماغ سے بوئے وفا ہنوز

م اب کہیں رہو مجھے شکوہ ذرا نہیں
ہے میری شاعری میں تمہاری ادا ہنوز

جن کی ہر ایک بات تھی بیتِ غزل وحید
ربط اُن سے اس قدر ہے نہ معلوم تھا ہنوز

باقر مہدی

○

ہم نوا ابھی جسے سمجھ نہ سکے
ہم نے کچھ ایسے گیت ہیں گائے
ان کو پا کر عجیب عالم ہے
خود کو ہم اجنبی نظر آئے
اشک افشاں بنے ہیں زلفوں میں
ہم نے کھوئے ہوئے گہر پائے
صبر کا ساتھ چھوٹ گیا
ہم رہے کشمکش کے ہم سائے
حسن کو آشنائے عشق کیا
اپنی جرأت پہ آپ شرمائے
جیت کر بھی ہوئے نہ ہم نازاں ہار کر بھی کبھی نہ پچھتائے

جلیل حشمی

افسردہ انجمن میں کھلایا ہے دل کا پھول
ہم نے درِ چمن پہ سجایا ہے دل کا پھول

پہنچی گی تا بہ دشتِ معطر کی روشنی
شامِ بہار ہم نے جلایا ہے دل کا پھول

عنبر فشاں نہ کیوں ہو تری رہگذر کی خاک
پیارے انہیں تبسم نے گنوایا ہے دل کا پھول

زنداں کی شام کتنی پُر آشوب شام تھی
کس کس جتن سے ہم نے بچایا ہے دل کا پھول

اس جادۂ وفا میں مسافر کے سامنے
آیا ہے سنگ بھی تو دکھایا ہے دل کا پھول

آندھی اٹھی تو شمع جلا کر نکل پڑے
پُروا چلی تو ہم نے چھپایا ہے دل کا پھول

تھے پائمال صورتِ سبزہ چمن میں ہم
حشمی مگر مہکتا ہی پایا ہے دل کا پھول

جلیل حشمی

کس کو آواز دوں اے بھرے راستے
کون آ کر گلے سے لگائے مجھے
میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے
اپنی باتیں کرے میری باتیں سنے
دیر تک میرے چہرے کو تکتا رہے
مسکرا دے کبھی پھوٹ کر رو پڑے
دھند میں بستیوں کے دیے چھپ گئے
برف کے پھول اب کے کچھ اتنے گرے
پھوٹتی ہے کرن میرے ہر نقش سے
آئے کوئی مری انگلیاں چوم لے
رہگزاروں پہ اترے ستاروں سے ہم
آپ جھانکے نہیں ہیں ابھی بام سے

محمود ایاز
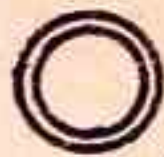
صحرا کی ہواؤں کو خبر تک نہیں جن کی
وہ گل بھی مری یاد کے دامن میں کھلے ہیں

خود ہم سے نباہی نہ گئیں پیار کی رسمیں
بچھڑے ہیں تو اب گردشِ دوراں کے گلے ہیں

◆

اس ترکِ تعلق میں اک ربطِ محبت ہے
اس ربطِ محبت کو، دُنیا نہ سمجھ پائی

غم اِن سے بچھڑنے کا اتنا تو نہ تھا لیکن
وہ سامنے جب آئے ہر چوٹ ابھر آئی

جاں اس کی امانت تھی غم تیری ودیعت تھا
کی ہم نے ترے غم کی جاں دے کے پذیرائی

بشیر بدر

نکہتِ رنگ و بادہ و سبزہ کیا
اے حقیقت نقاب جلوہ کیا!

شعلۂ گل گلابِ شعلہ کیا
آگ اور پھول کا یہ رشتہ کیا

تم مری زندگی ہو، یہ سچ ہے
زندگی کا مگر بھروسہ کیا

کتنی صدیوں کی قسمتوں کا امیں
کوئی سمجھے بساطِ لمحہ کیا

جو نہ آدابِ دشمنی جانے
دوستی کا اُسے سلیقہ کیا

جب کمر باندھ لی سفر کے لئے
دھوپ کیا چھنیہ کیا ہے سایہ کیا

دل دکھوں کو سبھی ستاتے ہیں
شعر کیا، گیت کیا، فسانہ کیا

سب ہیں کردار اک کہانی کے
ورنہ شیطان کیا فرشتہ کیا

دن حقیقت کا ایک جلوہ ہے
رات بھی ہے اُسی کا پردہ کیا

کام کی پوچھتے ہو گر صاحب
عاشقی کے علاوہ پیشہ کیا

جن کو دنیا غزل سمجھتی ہے
پوچھتے ہیں وہ شعر و مصرعہ کیا

جان کر ہم بشیر بدر ہوئے
اس میں تقدیر کا نوشتہ کیا

شفیق فاطمہ شعریٰ

پہنچے بیڑے ساحل تک اور اڑن کھٹولے تاروں تک
اپنے پیار کی خوشبو پہنچی آہ نہ اپنے پیاروں تک

مٹے میں امرت گھول کے ساقی اس موسم کو بھی اک جام
بھولا بھٹکا آیا ہے جو اپنے اجڑے دیاروں تک

اب تو تیشہ کی زد میں طلسم کا کہنہ گنبد ہے
گئے وہ دن جب اپنی جولانگاہیں تھیں کہساروں تک

دور افق میں نظریں گاڑے بیٹھے ہیں کچھ دیوانے
کیسے پہنچیں انکی پکاریں آنے والی بہاروں تک

جعفر شیرازی

رہے ہیں لاکھ زمانے کے ساتھ مِل جل کر
ملا نہ کوئی جسے حالِ دل کہیں کھل کر

غضب ہے اِن کو بھی ہم پہ رہے گماں کیا
دِکھا دیا تھا جنہیں نوکِ خار پہ تُل کر

نہالِ عشق پہ عکسِ بہار کیا دیکھیں
پڑا ہے آنکھ میں بارِ غبارِ غم گھُل کر!

یہ کیسا موت کا مجھ سے عجب سوال کیا
جواب دیتا ہوں لے زندگی تامّل کر

ابھی پیں گے وہ نشے جس سے غم مٹیں جعفر
اٹھو مناؤ خوشی جام آ گئے ڈھل کر

ساحر شیو پوری

پھر مجھے آرزوئے جام ہوئی
فکرِ دُنیا و دیں حرام ہوئی

میری توبہ کا اب خُدا حافظ
وہ چھپا آفتاب، شام ہوئی

ہم نے ہر دن کو پاؤں سے روندا
اپنی ہر رات نذرِ جام ہوئی

مُہر برلب تھی بند بوتل میں
جب لنڈھائی تو ہم کلام ہوئی

کچھ حسیں جلوے چند جامِ شراب
یہی جاگیر اپنے نام ہوئی

اُن کی نظروں سے کیا ملیں نظریں
روح سے روح ہمکلام ہوئی

مضطرب دل ہے روح بے تسکیں
زندگی کشمکش کا نام ہوئی

مے پرستی بھی چھوڑ دے ساحرؔ
یہ پرستش بھی رسمِ عام ہوئی

فضا کوثری

کوئی سمجھ نہ سکا اس طرح پیام لیا
تری نظر نے بڑی سادگی سے کام لیا

جنونِ شوق سمجھ لو کہ ہے خودی کھو لو
شباب و شعر کو ہاتھوں میں ہم نے تھام لیا

نہ جانے ہنس کے کہا اس نے زیرِ لب کیا کچھ
مجھے خیال یہ گزرا کہ میرا نام لیا

گہر فشانیٔ شبنم سے باخبر ہیں جو آپ
بتائیے مرے اشکوں سے کیا پیام لیا

ہزار بار سنانے فسانۂ غمِ دل
مگر حضور نے موقع دیا؟ سلام لیا

زبانِ ہوش رُبا کا جہاں کبھی ذکر چھیڑا
تمہارا نام فضاؔ نے بہ احترام لیا

تسلیم منیائی

نظر اٹھی بھی تو بالائے بام تک نہ گئی

حدیثِ خاص زبانِ عوام تک نہ گئی

تری نظر نے سکھائی وہ طرزِ بادہ کشی

مری طلب کبھی ساقی کے جام تک نہ گئی

زباں کو ضبط سکھایا ہے مدتوں میں نے

شکایتِ غم ہستی عوام تک نہ گئی

ابھی ہے یاد وہ وقتِ سحر کی بادہ کشی

وہ لذتِ مے و مینا جو شام تک نہ گئی

ہیں عرضِ شوق میں پابندِ گفتگو نہ ہوا

تسلیم اُن کی ادا بھی کلام تک نہ گئی

تبصرے

محمود ایاز

تبصرے کیلئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنی چاہئیں ورنہ تبصرہ نہیں ہوگا

ہمیں چراغ ہمیں پروانے

ہنری جیمز — ترجمہ قرۃ العین حیدر

ناشر: مکتبہ جدید لاہور۔ ضخامت ۶۰۰ صفحے قیمت دس روپے

"ہمیں چراغ ہمیں پروانے" ہنری جیمز کے ناول THE PORTRAIT OF A LADY کا ترجمہ ہے اس ناول کا ہنری جیمز کے بہترین ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ خود ہنری جیمز نے اس ناول کو ترتیب تعمیر اور ہیئتی تکمیل کے اعتبار سے ایک شہ پارہ اور اپنے بہترین ناول THE AMBASSADOR کا ہم پلہ قرار دیا تھا۔

ازابل آرچر اپنے مقدر سے جدا آزما ایک نوجوان لڑکی اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔ ازابل ایک شاہ خرچ عاقبت اندیش مگر اپنے بچوں سے بے حد محبت کرنے والے باپ کی سب سے چھوٹی اور تیسری لڑکی ہے جو بچپن ہی سے اپنے علمی ذوق اور جذباتی احساس کی وجہ سے ہمیشہ سب سے مختلف اور ممتاز رہی۔ ازابل کے باپ کی بہن مسز ٹچٹ جو اس وقت امریکہ آئی ہوئی ہیں۔ اپنی بھانجی سے ملنے آتی ہیں اور ازابل کی خود اعتمادی اور ذہانت سے متاثر ہو کر اسے اپنے ساتھ انگلینڈ لے آتی ہیں۔ مسز ٹچٹ کے شوہر اور ان کا لڑکا رالف ازابل کو بے انتہا پسند کرنے لگتے ہیں اور مسز ٹچٹ اپنے وصیت نامہ میں ازابل کے نام ایک بڑا ترکہ چھوڑ جاتے ہیں۔ رالف جو دق کا مریض ہے ازابل کی بھرپور زندگی میں اپنی محرومیوں کی تلافی کرنا چاہتا ہے اور اپنے مرتے ہوئے باپ کو راضی کر لیتا ہے کہ وہ اس کے حصہ میں سے بھی ایک بڑی رقم ازابل کے نام منتقل کر دیں اور اس طرح وہ ازابل کو خود مکتفی بنا کر اسے اپنی آرزوؤں اور آدرشوں کے مطابق زندگی گذارتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہے۔

ازابل حسن، دولت، ذہانت اور خود اعتمادی کا زادِ سفر لے کر اپنی مہم پر نکل پڑتی ہے۔ زندگی کی ساری نعمتوں سے لطف اندوز ہو سکنے کی پوری آزادی کے باوجود اس کے کردار میں بے راہروی نہیں ہے۔ زندگی کے لطیف اور برتر تصورات اسے بجد عزیز ہیں۔ اسے علم کی پیاس ہے۔ اپنے ذہنی افق کو وسیع سے وسیع تر بنانے کی آرزو ہے۔ اپنی شخصیت کو تجربات سے زرخیز بنانے کی تمنا ہے۔ زندگی میں بلند ترین اور غیر معمولی اعزاز کی اہل اور مستحق بننے اور ثابت کرنے کی خواہش ہے۔ ان مقاصد کی تکمیل کے لئے وہ یورپ کی سیاحت پر نکلتی ہے۔ ان مقاصد سے اس کی لگن اتنی گہری ہے کہ وہ لارڈ واربرٹن جیسے خوبصورت، وجیہہ دولت مند اور ذہین نوجوان کا شادی کا پیغام مسترد کر دیتی ہے اپنے ساتھی امریکی امیدوار کیسپر گڈ وڈ کو صاف جواب دے دیتی ہے کیونکہ اسے دنیا میں شادی کے علاوہ اور بھی بہت کام کرنے ہیں۔ ناول کے ساتھ ساتھ پڑھنے والے بھی اس آدرش وادی لڑکی کے مستقبل سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ کر لیتے ہیں۔ اتنی اولوالعزم اتنے اونچے اونچے خواب دیکھنے والی لڑکی کی زندگی یقیناً غیر معمولی ہونی چاہیئے۔

لیکن ازابل اپنی تقدیر سے جیت نہیں سکتی۔ اپنی ذہانت، حسن، دولت، خود اعتمادی اور سارے آئیڈیلز کے باوجود (یا ان کی وجہ سے) زندگی کے سارے اہم کاموں کو بھول کر وہ ایک خود غرض، سفلے اور کمینے آدمی گلبرٹ اوسمنڈ سے شادی کر کے اپنی زندگی کو جہنم بنا لیتی ہے۔ اتنے خوبصورت خواب دیکھنے والی لڑکی اپنی مرضی سے اتنی عامیانہ حرکت کر گئی۔ کوئی سوچ تک نہیں سکتا تھا۔ گلبرٹ اوسمنڈ میں ازابل کو وہ سب چیزیں نظر آئیں۔ جو اسے اپنی زندگی میں عزیز تھیں تجربہ کی گہرائی۔ دنیاوی کثافتوں سے [illegible] بچنے والا ذہن۔ طبیعت کی متانت اور دھیما پن۔ فنونِ لطیفہ کا رچا ہوا ذوق۔ روپیہ پیسے سے قلندرانہ استغنا، وہ ان تمام مردوں سے مختلف تھا جو ازابل کی زندگی میں آئے تھے لیکن شادی کے بعد ازابل کو پتہ چلا کہ اوسمنڈ کی ساری خوبیاں دراصل اس کے اپنے ذہن کی پیداوار تھیں۔ اور تو اور اوسمنڈ کو اس سے محبت بھی نہیں تھی۔ وہ تو صرف اس کی دولت کا خواہاں تھا۔

یہاں سے ازابل کی زندگی کا دوسرا اور حقیقی دور شروع ہوتا ہے۔ ازابل کے سارے دوستوں نے اسے اس شادی سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔ بھلا اب ازابل کس طرح ان کے سامنے اپنے غلط فیصلہ کا اعتراف کر لیتی؟ اوسمنڈ کی خباثتِ نفس ازابل کیلئے زندگی کو جہنم بنا دیتی ہے۔ لیکن اسے

اس آگ میں جل جل کر مرجانا منظور ہے مگر اس کی خودداری یہ اجازت نہیں دیتی کہ وہ دنیا کے سامنے
اپنی غلطی کا اعتراف کرے اور اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کرے۔ رآلف کی موت سے چند دن
پہلے وہ انگلستان آتی ہے۔ اور رالف کی موت کے بعد اپنی سہیلی اور کیسپر گڈوڈ کے اصرار کے باوجود اپنے
شوہر اور سوتیلی بیٹی کے پاس واپس روم چلی جاتی ہے۔

اس کے بعد ازابل کی آئندہ زندگی کیسے گذری؟ اس استفہامیہ نشان پر ناول کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔
اس بظاہر معمولی سی کہانی میں جو انگریزی کے تقریباً آٹھ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ ہنری جیمز نے
نفسیاتی اندرونی بینی کے ذریعہ انسانی سرشت کے چند ایک پہلوؤں کو مکمل فنکارانہ اور جانفشانی کے
ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ ناول صرف فنی تکمیل کا ایک اعلیٰ نمونہ اور ایک لڑکی کی جدوجہد اور ناکامی کی داستان
نہیں ہے۔ بلکہ ازابل آرچر کے آدرشوں کی شکست اور اس کے المیہ میں جیمز نے زندگی کے چند
بنیادی حقائق کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کیا انسانی زندگی تمام مادی موانع سے آزادی حاصل کرنے
کے بعد مکمل ہو جاتی ہے؟ کیا انسان اپنی ہر آرزو کی تکمیل کے ذرائع حاصل ہو جانے کے بعد سکون اور
طمانیت حاصل کر سکتا ہے؟

رالف جب اپنے بوڑھے باپ کو راضی کرتا ہے۔ کہ وہ اس کے اپنے حصہ سے بھی ایک بڑی رقم ازابل
کے نام منتقل کر دے۔ تاکہ وہ مکمل آزادی کے ساتھ اپنی آرزوں اور اپنے مقاصد کے مطابق زندگی گذار سکے
اور مفلسی کی وجہ سے اپنے آئیڈیلز کو قربان کر کے زندگی کی عامیانہ ضرورتوں سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور
نہ ہو تو جہاندیدہ باپ پوچھتا ہے "کیا کسی انسان کیلئے زندگی کو اتنا آسان بنا دینا اخلاقی اعتبار
سے غلط بات نہیں ہے؟"

ازابل کی زندگی اور اس کا انجام اس سوال کا جواب دیتے ہیں۔ زندگی میں غم اور محرومی خوفناک چیز
نہیں ہے اور ان سے گریز یقیناً مسرت اور اطمینان کا لازمی پیش خیمہ نہیں ہوتا۔ خود ازابل کو اس کا احساس
ہے لارڈ وار برٹن سے شادی کی درخواست کو مسترد کرتے ہوئے وہ کہتی ہے "میں غم سے بچ نہیں سکتی
آپ سے شادی کا مطلب گویا فرار کی کوشش ہے میں کبھی بچنے پر مصر نہیں ہوں۔ میں نے اکثر خوش رہنے کا
پکا ارادہ کیا ہے اور اکثر یہ یقین بھی کیا ہے کہ میں خوش رہ سکتی ہوں۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ میں کسی
غیر معمولی طریقے سے کبھی نہ ہونگی — راستے سے مڑ کے۔ خود کو علیحدہ کر کے — زندگی سے اس کے عام

واقعات اور خطرات سے دوسرے انسانوں کے تجربوں اور تکلیفوں سے۔ میں اپنے آپ کو ان چیزوں سے کس طرح الگ کر سکتی ہوں؟"

لیکن یہ احساس اس کی زندگی میں کبھی بھی ایک شعوری اور اثباتی عمل نہیں بن سکا تقدیر کی زبردست گرفت اور آنے والے خطرات کا ایک لاشعوری احساس چند لمحوں کے لیے جاگ اٹھا ہے ورنہ ازابل نے ہمیشہ اپنی ذات کو ساری حیات و کائنات کا مرکزی نقطہ سمجھ کر زندگی گزارنے کی کوشش کی۔

گلبرٹ اوسمنڈ سے شادی کے بعد جو بظاہر ازابل کی زندگی کا المیہ ہے ازابل کے کردار میں ایک نئی توانائی، گہرائی، معنویت اور کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ اس غلط شادی کے المیہ نتائج ازابل کی شخصیت کی تکمیل کرتے ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ازابل کا انجام ناگزیر تھا؟ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ اگر وہ اوسمنڈ سے شادی کا غلط فیصلہ نہ کرتی تو اپنے آدرشوں میں کامیاب ہو جاتی؟ بظاہر یہ ممکن معلوم ہوتا ہے بشرطیکہ اس کی ناکامی کو ایک کمزور لمحہ کی لغزش پر محمول کر لیا جائے۔ لیکن در حقیقت ایسا نہیں ہے۔ یہ ناکامی تو ازابل کے آدرشوں میں ہی پوشیدہ تھی۔ اس کی تعمیر میں ہی خرابی کی صورت مضمر تھی۔ وہ اگر اوسمنڈ سے شادی نہ بھی کرتی تو اس کی زندگی کو ناکامی پر ہی منتج ہونا تھا۔ ازابل نے زندگی سے بڑی بڑی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔ لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ آئیڈیلز صرف جد و جہد کے لیے ہوتے ہیں حصول کے لیے نہیں۔ ان کے حصول کی جد و جہد میں آدمی یا تو منزل تک پہنچتے پہنچتے ہی ختم ہو جاتا ہے۔ یا پھر حصول کے بعد پتہ چلتا ہے کہ دراصل تلاش تو کسی اور ہی چیز کی تھی۔ اس کے بعد بس یہ شکایت کرتے رہیے کہ "اب لطف خواب بھی نہیں احساس خواب میں"۔ محرومی کا یہ عنصر ناول کے سارے کرداروں کی زندگیوں میں مشترک ہے سوائے ہنریٹا اسٹاک پول کے

ہنریٹا کی تخلیق ہنری جیمس نے ناول کی دلچسپی کے خاطر کی تھی۔ اس کے ذریعے جیمس نے انگلستان اور امریکہ کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ عورتوں کی معاشی آزادی اور مساوات کی پرجوش حامی، امریکی جمہوریت پرستی پر ناقابل شکست یقین رکھنے والی، روایات کے رسوم و قیود سے آزاد، انگلستان اور بحیثیت مجموعی سارے یورپ کو ترحم اور حقارت کی نظر سے دیکھنے والی یہ اوسط درجے کے ذہن کی بالطبع نیک اور مخلص لڑکی امریکی طرز حیات اور امریکی ذہن کی نمائندگی

کرتی ہے اسے امریکہ کی ہر بات میں برتری کا شدید احساس ہے اس کا یہ پختہ یقین ہے کہ امریکہ کو یورپ کا نجات دہندہ بننا ہے۔ اپنے ملک سے اس کی وابستگی مجنونانہ عصبیت کو پہنچی ہوئی ہے اسے اپنے آپ پر بے حد اعتماد ہے۔ اعتماد تو ازابل کو بھی اپنے آپ پر بہت ہے۔ لیکن ہنریٹا کے اعتماد کی نوعیت بہت مختلف ہے۔ اس اعتماد میں خوش عقیدگی کا دخل زیادہ ہے ہر چیز کے بارے میں اس کے خیالات اٹل ہیں۔ اس کے پاس رد و قبول اور ترک و اختیار کے ناقابل ترمیم و تنسیخ معین پیمانے موجود ہیں۔ ایسی شخصیت کے لئے کسی گہری داخلی جد و جہد یا کسی المیہ صورت حال پر منتج ہونے والی اخلاقی کش مکش کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا! واسی وجہ سے اس کی زندگی میں قلب و روح کی تطہیر کرنے والے کسی گہرے المیہ کی گنجائش بھی ناممکن ہے سچ پوچھئے تو ہنریٹا سو فیصد امریکن ہونے کے باوجود بہت ساری باتوں کے لحاظ سے اس ناول کا روایاتی "ترقی پسند کردار" معلوم ہوتی ہے۔

اس ایک کردار کے علاوہ ناول کے دوسرے تمام کردار اپنی اپنی صلیب کا بار اٹھائے ہوئے ہیں مسز توشیٹ نے عام نقطۂ نظر سے بڑی کامیاب زندگی گزاری۔ دولت عزت تحفظ سب کچھ ملا۔ لیکن بیوی ایسی ملی کہ ازدواجی زندگی کی کوئی راحت نصیب نہ ہوئی

رالف پر تولنے سے پہلے ہی دق کا شکار ہو کر رہ گیا۔ ازابل کی بلند پروازی میں اس نے اپنی بے پر و بالی کی تلافی ڈھونڈنی چاہی۔ لیکن اس عالی ظرف آدمی نے جس کشتی کو ایک عظیم الشان مہم کے لئے بادبان مہیا کئے تھے وہ ساحلوں سے قریب ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ رالف کے ذہن میں بڑی آب و تاب سے اس کا کردار ڈیوی کے اس خیال کی مکمل تفسیر ہے کہ "عملی زندگی میں انسان کا اعتراف عجز فلسفہ آرائی کی شکل اختیار کر لیتا ہے:"

لارڈ وار برٹن اور کیسپر گڈ وڈ دونوں ازابل سے پرستش کی حد تک محبت کرتے ہیں لیکن ازابل اپنی قسمت کا انتخاب کرنے کی مہم میں دونوں کو ٹھکرا دیتی ہے! اوسمنڈ سے شادی کے بعد بھی ازابل کے لئے ان کی محبت میں فرق نہیں آتا [illegible] لارڈ وار برٹن ازابل کی سوتیلی لڑکی سے صرف اس خیال کے تحت شادی کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے کہ اس طرح وہ کم از کم ازابل کے قریب رہ سکے گا۔ اس کی خبر گیری کر سکے گا۔ جب اس ارادے میں بھی ناکامی ہو جاتی ہے تو انتہائی دل شکستگی

ے عالم میں آنکھ بند کر کے کسی بھی لڑکی سے شادی کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ تاکہ کم از کم اس طرح اپنے آپ کو ازابل کے ترل سکنے کا یقین دلا سکے۔

وار برٹن تو خیر بہت بلند آدمی تھا۔ کیسپر گڈ ووڈ بھی اوسمنڈ سے کہیں زیادہ ازابل کا مستحق تھا۔ وار برٹن یورپ کی اُس تہذیب اور روایات کا نمائندہ تھا۔ جن کے سرچشموں تک پہنچ کر نئی دنیا کی ازابل اپنی شخصیت کی تکمیل کرنا چاہتی تھی۔ اوسمنڈ بھی انہیں روایات کا مدعی تھا۔ مگر ازابل کھرے اور کھوٹے میں فرق نہ کر سکی اور اوسمنڈ کی شر کی قوت فتح یاب رہی

مادام مرل ایک طرح سے ازابل کے کردار کا CONTRAST پیش کرتی ہے۔ مادام مرل کے پاس وہ سب کچھ ہے جو ازابل زندگی میں حاصل کرنا چاہتی ہے۔ لیکن مادام مرل اُن وسائل سے عمر بھر محروم رہی جو ازابل کو اتنی آسانی سے مہیا ہو گئے تھے۔ جن چیزوں کا حصول ازابل کے نزدیک مقصدِ حیات ہے۔ وہ چیزیں مادام مرل کے لئے ذرائع سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں مادام مرل زندگی میں آسائش، اطمینان۔ دولت۔ شوہر اور بچوں کی محبت کے لئے اپنی شخصیت کو داؤ پر لگاتی ہے۔ ازابل کے پاس دولت حسن۔ ذہانت اور سماجی حیثیت سب موجود ہے۔ لیکن وہ اپنی زندگی کے خلا کو تجربات اور ذہنی اکتسابات سے پُر کرنا چاہتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے پر رشک کرتی ہیں۔ ازابل سمجھتی ہے کہ مادام مرل کے پاس ماضی کی خوبصورت یادیں ہیں۔ ذہن و دماغ کی دولت سے نفاستِ طبع ہے۔ وہ اُس کے نزدیک نفرت و کامیابی کا جیتا جاگتا مرقع ہے لیکن مادام مرل سوچتی ہے "ذہن و دماغ نے مجھے کیا فائدہ پہنچایا؟ ان کے سہارے میں گھڑیاں برس عمر بتائے جا رہی ہوں۔ کسی نہ کسی دُھن میں خود کو لگائے رکھ کر اپنے آپ کو دھوکا دینے میں مشغول رہتی ہوں۔ کاش مجھے اکبار

پھر سے ازابل کی عمر سے زندگی شروع کرنے کا موقعہ ملتا"

ازابل اور مرل دونوں نے بڑے حوصلوں کے ساتھ زندگی کی ابتدا کی اور دونوں ناکام رہیں۔ ازابل کے کردار اور اخلاقی قوت کا مرل کے پاس فقدان ہے لیکن اس کی ذمہ داری بہت بڑی حد تک اس کے حالات اور ماحولی اثرات پر بھی عائد ہوسکتی ہے۔ بلکہ مجھے تو مرل کی ناکامی میں ازابل کے المیہ سے کہیں زیادہ گہرے المیہ کے امکانات نظر آتے ہیں۔

میں نے اوپر کہیں ازابل کے متعلق لکھا ہے کہ اس نے ہمیشہ اپنی ذات کو حیات و کائنات کا مرکزی نقطہ سمجھ کر زندگی گذارنے کی کوشش کی۔ یہ بات صرف ازابل ہی نہیں بلکہ ناول کے تقریباً ہر کردار کے متعلق کہی جا سکتی ہے ان کی ساری جد و جہد اور آرزوئیں اپنی اپنی ذات کے دائروں میں محدود ہیں۔ شاید اسٹیفن اسپینڈر نے ہنری جیمز کے کرداروں کے متعلق کہا تھا کہ ان کا سب سے بڑا پرابلم ان کی بے کاری اور دولت مندی ہے۔ اگر انہیں اپنی زندگیوں کے لئے ایک عام آدمی کی طرح روزانہ آٹھ دس گھنٹے جد و جہد کرنی پڑتی تو پھر ان سارے مسائل کا وجود ہی باقی نہ رہتا جو ان لوگوں کو مستقل پریشان رکھتے ہیں۔ بنیادی طور پر اس خیال کی صداقت سے انکار ممکن نہیں۔ مگر ہنری جیمز کے معاملہ میں اس کا اطلاق صحیح نہیں ہے کیونکہ ان کے تمام ناول دراصل ان کے مخصوص نظریات اور فلسفۂ حیات کے اظہار کا ذریعہ ہیں لیکن اس سے یہ غلط فہمی نہ پیدا ہو جائے کہ اس اظہار کی خاطر انہوں نے حالات اور کرداروں کی تعمیر میں فنی، نفسیاتی اور منطقی مطالبات کو قربان کر دیا۔ بلکہ اس کے برعکس ان تمام تقاضوں سے پورا پورا انصاف کرتے ہوئے ان کے ناولوں میں واقعات حالات اور کرداروں کی تعمیر و تشکیل اس طرح ہوتی ہے کہ ان کی مرکزی تعمیم خود بخود ابھر آتی ہے۔ اس طریقۂ کار میں ایک مخصوص طبقہ اور ماحول انتخاب ناگزیر تھا۔

یہ ناول پڑھتے ہوئے مجھے ازابل کے کردار میں قرۃ العین حیدر کے کئی ایک کرداروں کی جھلکیاں نظر آئیں۔ پڑھ لکھ کر بے انتہا عالم و فاضل بن کر معاشی "آزادی" حاصل کرنے والی اور زندگی کے متعلق حسین و جمیل خواب دیکھنے والی انٹلکچوئل لڑکیاں گیتی کول، بینا، درخشندہ ان کے آئیڈیلز اور DISILLUSIONMENT کی داستانیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ترجمے کے لئے ہنری جیمز کے اس ناول کا انتخاب ناشر نے نہیں بلکہ قرۃ العین حیدر نے کیا ہے اور شاید اسی ذہنی ہم آہنگی نے

ے میں اصل کی شان پیدا کر دی ہے۔

ہنری جیمز کے ناولوں میں فلسفیانہ سنجیدگی نفسیاتی ژرف بینی ان کے اظہار اور اسلوب کی گہرائی اور
گی ترجمے کو بہت مشکل بنا دیتی ہے لیکن قرۃ العین حیدر نے ترجمے میں اصل کی ہر سطر سے پورا
اف کیا ہے۔ بلاشک و شبہ اس ناول کا اردو کے چند ایک کامیاب ترجموں میں شمار ہوگا۔

بڑے سائز کے تقریباً چھ سو صفحات پر مشتمل یہ ناول مکتبہ جدید نے اپنے روایتی انداز میں خوبصورت
نی خیز گرد پوش کے ساتھ پیش کیا ہے۔ لیکن قیمت کی وجہ سے (دس روپیہ) خوف ہوتا ہے کہ
یہ ناول زیادہ لوگوں تک نہیں پہنچ سکے گا۔

تارِ پیراہن

مصنف .... شان الحق حقی

ناشر .... اردو اکاڈمی سندھ کراچی

قیمت .... پانچ روپے

گزشتہ دس سال میں غزل گوؤں کی جو نسل سامنے آئی ہے اُن میں شان الحق حقی نمایاں حیثیت
تے ہیں۔ تارِ پیراہن ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔

مجموعے میں مصنف کا خود نوشت مقدمہ بھی شامل ہے۔ اس میں جو باتیں کہی گئی ہیں اُن سے مصنف
ی ذہنی اکتسابات اور فکر کی گہرائی کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن مقدمہ پڑھتے ہوئے مصنف کا جو ذہن نظروں
سامنے آتا ہے اس کی کوئی جھلک تارِ پیراہن میں مشکل سے ملے گی۔

مجموعے کو چھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ "تارِ پیراہن" "نو آہنگ" "نغمہ جولاں" "بازیافت" ۔
اودال" اور "جوشِ مینا" ــ پہلے اور آخری دو عنوانات کی تقسیم ضروری نہیں تھی کیونکہ ان عنوانات
ذیل میں جو غزلیں اور متفرق اشعار دیے گئے ہیں۔ وہ ایک ہی حصے میں آسکتے تھے "نو آہنگ"
قطعات اور مختصر نظمیں شامل ہیں۔ "فن" اس حصے کی بہترین نظم ہے۔ "نغمہ جولاں" میں بقول مصنف
ت و آہنگ کے کچھ نئے تجربے کیے گئے ہیں۔ "بازیافت" میں بنگالی اور انگریزی کی چند نظموں اور

شکسپیر کے "انطنی اور قلوپطرہ" کا منظوم ترجمہ کیا گیا ہے۔ مصنف نے مقدمے میں اس حصے کو مجموعہ
آبرو کہا ہے جو کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا! ان تراجم میں کوئی خاص بات نہیں ہے چند غیر زبان
چیزوں کا صاف و شستہ اردو میں تخلیقی ترجمہ کیا گیا ہے۔ جن چیزوں کے ترجمے ہوئے ہیں ان کے انتخاب
میں بھی کسی خاص معیار یا نقطۂ نظر کا پتہ نہیں چلتا۔ شکسپیر کے ڈرامے کا ترجمہ شاید اس بنا پر
تجربہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں مثنوی اور ڈرامے کی امتزاجی شکل پیدا کرنے کی کوشش کی
ہے۔ بعض بعض مقامات پر ڈرامے کے اصلی ٹکڑوں کو اس ڈھنگ کے ساتھ اردو میں منتقل کیا گیا
کہ بے ساختہ کہنا پڑتا ہے۔

مکن گمان تو ارد، یقین شناس کہ دزد
متاعِ من ز نہاں خانۂ ازل برداشت

لیکن حقیقی ترجمے میں اصلی ڈرامے کا وقت، فضا اور ماحول نہیں پیدا کر سکے۔ قلوپطرہ کی زبان
سے دلی کی بیگمات کی بول چال بھی کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔

"نغمۂ جولاں" میں ہیئت و آہنگ کے تجربے تو ہیں لیکن ان تجربوں کو نیا کہنا صحیح نہیں لہجہ
اور فکر کی رفتار کو برقرار رکھنے کے لئے ایک ہی نظم میں مختلف بحور کا استعمال اب اتنی پرانی چیز
ہو چکا ہے کہ اسے ایک تجربہ کہنا بھی ٹھیک نہیں معلوم ہوتا! اس حصے میں دو طویل نظمیں اور ایک
مختصر نظم شامل ہے۔

"تازہ بستیاں" اور "نغمۂ نوروز" طویل ملی نظمیں ہیں جن کو مصنف ہیئت و آہنگ کے
تجربے سمجھتے ہیں۔ لیکن اس حصے کی بہترین نظم "بیتی برسات" ہے۔ یہ نظم آج سے کوئی پندرہ سال
اس سے بھی پہلے "ساقی" میں شائع ہوئی تھی۔ مگر مختلف شکل میں اس وقت اس کی حیثیت ایک
قسم کی ہلکی پھلکی اچھی نظم سے زیادہ نہیں تھی۔ اور دلی کی خواتین کی زبان کا برجستہ اور بے ساختہ
استعمال نظم کا نمایاں وصف تھا۔ لیکن اب بدلے ہوئے حالات میں نظم کی ابتدا اور اختتام پر تین
اشعار کا اضافہ اسے زیادہ گہری، با معنی اور پر اثر چیز بنا دیتا ہے۔ غریب الوطنی کا الم، گذشتہ
دنوں کے پلٹ کر نہ آسکنے کا احساس حال سے ماضی کی طرف جست FLASH BACK
اور پھر حال میں واپسی کی تکنیک نے نظم میں وقت کا بڑا گہرا احساس پیدا کر دیا ہے! اور

روایات کی بازیافت سے ماضی اور حال میں جو رشتہ پیدا ہوتا ہے وہ اس نظم کو بہت
ب چیز بناتا ہے۔

اس مجموعہ کی اصلی چیز اس کی غزلیں ہیں۔ یہاں حقی کی شاعرانہ شخصیت کا مکمل اور موثر اظہار
ے ان غزلوں میں ایک خاص لب و لہجہ اور بات کہنے کا اپنا انداز موجود ہے۔ غزل کے قدیم
اظہار کا استعمال اس طرح ہوا ہے کہ الفاظ اور تراکیب کو جذبے کی شدت اور احساس کی گہرائی
ک نئی فضا بخش دی ہے زبان و بیان پر اتنی مکمل گرفت جدید شاعروں کے یہاں اور کہیں
ں سے ملے گی۔ بیشتر غزلیں بہت جاندار ہیں۔ اور کہیں کہیں تو اتنے پیارے اشعار نکل گئے
ے بے ساختہ یہاں نقل کرنے کو جی چاہتا ہے۔

طرف جاتے ہیں بارو یہ بگڑتے ہوئے نقش ؎ یہ سنورتی ہوئی تصویر کہاں سے آئی
ے ساز سے اک موج ہوا گذری تھی ؎ یہ چھنکتی ہوئی زنجیر کہاں سے آئی
ی ہو جاتا ہے قسمت سے کوئی غم بیدار ؎ عشق کے ہاتھ میں تدبیر کہاں سے آئی

ے الفت کے تقاضے نبھائے جاتے ؎ ورنہ ہم کو بھی تمنا تھی کہ چاہے جاتے

ں صبح یوں گم ہے کہ اب نکلے نہ تب نکلے ؎ ادھر انداز شب ایسا کہ گویا ہو گئی آخر
آنکھوں کا بس اک خواب تھی وہ حسرت پنہاں ؎ جو خود اُن کی نگاہوں کا تقاضا ہو گئی آخر

نے یوں غرض محبت پہ سنبھل کر دیکھا ؎ اُس کے دل کو تو خبر ہو نہ گماں ہو جیسے
کو آئینہ بنایا ہے کہ بارے اک دن ؎ اپنی صورت ہی پہ ظالم تجھے پیار آئے کہیں
بے ہے قافلہ عمر رواں اے حقی ؎ اُس کا در آئے کہیں اُس کا دیار آئے کہیں

تیاں ہو بہت ہیں مری یادیں مجھ کو ؎ تم سے پیاری تو نہیں دل کی مرادیں مجھ کو

مجھ کو اک رخصتِ فریاد بہت ہے خفیؔ ؛ تا قیامت رہیں احباب غزل خواں میرے

یوں دعا مانگ کے شرمندہ ہوں دل میں جیسے ؛ تیری خاطر سے در غیر پہ دی ہو دستک

چلو یادِ دل میں جلا کر کتنی یادوں کے چراغ ؛ عمر کا وہ لمحۂ روشن کہ ٹھہرا ہی نہیں

دے گیا ہے نظر کو تیرا غم ؛ اک سحرِ نور اک چمن شبنم
یہ بھی تھی حسرتِ نمو کی جبلی ؛ بجھ رہی ہے سلگ سلگ کے کلی

ختم تھا خامشی پہ کمالِ سخن ؛ سارے صاحب کمالوں کو نیند آ گئی

اس مجموعے سے خفیؔ کی شاعرانہ صلاحیت، فکر و نظر کی انفرادیت، ذہانت اور طبیعت کی جو
کا اظہار ہوتا ہے۔ اگر وہ ان خداداد صلاحیتوں کو کسی ایک چیز پر مرکوز کر سکیں تو ان سے بہت
توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ مصوری، تنقید، افسانہ نگاری، غزل گوئی اور تراجم نویسی وغیرہ
طبع آزمائی کی کوشش انہیں کسی چیز پر جم کر کام کرنے کا موقع نہیں دیتی۔ اس طرح آدمی
صلاحیتیں منتشر ہو کر رہ جاتی ہیں VERSATILE ہونا بڑی چیز ہے۔ لیکن عموماً
VERSATILE قسم کے لوگ اپنی بے پناہ صلاحیتوں کے باوجود بہت کم کسی چیز میں کمال
درجہ حاصل کرتے ہیں۔ ہمہ گیر ہونے کی دھن میں آدمی کہیں کا بھی نہیں رہتا۔ ممکن ہے خفیؔ
اپنے اظہار کے لئے موزوں اور مناسب ذریعے کی تلاش میں ہر صنف کو تجرباتی طور پر آزما رہے
ہیں۔ نے پہلے کہیں کہا ہے کہ مقدمے سے مصنف کا جو ذہن نظروں کے سامنے ابھرتا ہے
مجموعہ میں اس کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔ اور یہ واقعی افسوس کی بات ہے۔ حقیقت کی ماہیت
اور اس کے ادراک و اظہار کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے اپنی شاعری کی توضیح
(یا جواز؟) پیش کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ بڑی حد تک عذرِ گناہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

...ں سے قطع نظر اس مقدمے سے اُن کے مطالعے کی وسعت اور فکر و نظر کی گہرائی کا پتہ چلتا ہے اور یہ ایسی چیزیں ہیں جو ہمارے اچھے اچھے شاعروں کے ہاں بھی بہت کم ملتی ہیں۔ اور اسی لئے محسوس ہوتا ہے کہ حقی ان چیزوں سے اپنی شاعری میں وہ کام نہیں لے رہے ہیں۔ جو اس دور کے عظیم شعری کارناموں کی تخلیق کا باعث بن سکتا ہے۔

نیا دور

(۱۳ — ۱۴)

صفحات: ۲۶۰ قیمت پانچ روپے

شائع کردہ: پاکستان کلچرل سوسائٹی۔ کراچی ۵

ایسا معلوم ہوتا ہے پاکستان میں ناشر حضرات خوبصورت اور ضخیم پرچے نکالنے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہتے ہیں۔ "خیر" کے کاموں میں "سبقت" لے جانے کی کوشش بہت مبارک سہی لیکن ان کوششوں کا ذرا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو تھوڑی بہت مایوسی بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ بالعموم پرچے کی ضخامت اور ظاہری گٹ اپ پر جو توجہ دی جاتی ہے وہ مندرجات مواد کے انتخاب و معیار پر نہیں دی جاتی۔ نیا دور کا زیرِ نظر شمارہ بھی اس نقص سے بری نہیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس شمارے کی کئی ایک چیزیں شائع شدہ ہیں۔ افسر انصاری کی "یادیں" علی گڑھ میگزین میں چھپ چکی ہیں۔ اختر الایمان کی پانچ نظموں میں چار نظمیں بہت پہلے چھپ چکی ہیں۔ باقر مہدی کی نظم اور غزل اُن کے مجموعے میں شامل۔ نظر حیدر آبادی کی غزل شائع شدہ ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کی ایک غزل صبا میں شائع ہو چکی تھی۔ شہرت بخاری کی غزل خود نیا دور کے شمارہ نمبر گیارہ۔ بارہ میں شائع ہو چکی تھی ابھی کو دوبارہ اس شمارے میں شہر یک کیا گیا ہے۔ جمیل الدین عالی کے مجموعے کلام پر نیا دور کے گزشتہ شمارے میں دو دو تبصرے کرائے گئے تھے اس کے باوجود زیرِ نظر شمارے میں پھر ایک اور تبصرہ دیا گیا ہے اگر عالی کے کلام پر مزید روشنی ڈالنے یا ایسے تبصرہ نگاروں سے اختلاف کی ضرورت محسوس بھی ہوئی تھی۔ تو اس کا اظہار مراسلے کی صورت میں ہو سکتا تھا یا پھر مضامین کے حصہ

میں ایک مستقل مقالے کی گنجائش تو بہتیرہ نکل سکتی تھی۔ ورنہ اس طرح ایک کتاب پر تین تین مرتب تبصرے کروانا اصولی لحاظ سے غلط بات ہے۔

افسانوں کے حصے میں سب سے اچھا افسانہ ہاجرہ مسرور کا ہے۔ شوکت صدیقی افسانوں کو دلچسپ بنانے کی کوشش میں اکثر اوقات مرکزی خیال کو داستان سرائی کی نذر کر دیتے ہیں۔ افسانے میں SUSPENSE پیدا کرنا بری بات نہیں۔ لیکن اسی کو مقصد بالذات قرار دے لینا غیر صحت مند رجحان ہے۔ اُن کا زیر نظر شمارے میں شامل افسانہ گو مکمل طور پر نہیں مگر پھر بھی بڑی حد تک اس عیب سے پاک ہے۔ شوکت تھانوی کا افسانہ طفلانہ ہے اور کسی معیاری ادبی جریدے میں شائع ہونے کے قابل نہیں تھا۔ واجدہ تبسم کے افسانے پر گمان ہوتا ہے کہ یہ شاید اُن کے ناول کا ایک باب ہو۔ لیکن چونکہ اس کی وضاحت نہیں کی گئی ہے اس لئے اسے افسانہ ہی ماننا پڑے گا گو یہ کہیں سے بھی افسانہ معلوم نہیں ہوتا۔ واجدہ تبسم کے یہاں جو چیز ابتدا میں جاذبِ توجہ بنی تھی اب اُن کے انحطاط کی خبر بھی سنا رہی ہے جنس ہو یا اشتراکیت ادب کے لئے کوئی موضوع ممنوع نہیں۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ افسانہ نگار اِن چیزوں کو کس طرح موضوع بناتا ہے،........ کس PERSPECTIVE میں پیش کرتا ہے اور اِن کے بارے میں اُس کا رویہ کیا ہے زیر نقد افسانے میں جنسی باتوں کا ذکر مریضانہ ذہنی لذت اندوزی کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ جو طبقہ اس افسانے کا موضوع بنا ہے اُس طبقہ اور مخصوص ماحول کے افراد میں سماجی وجوہات کی بنا پر یہ غیر معمولی جنس زدگی حقیقت سے بعید نہیں۔ لیکن سوال افسانہ نگار کے رویے اور موضوع ... کے TREATMENT کا ہے۔

سلیم احمد کا ڈرامہ "تیمور" تاثر آفرینی کے اعتبار سے ناکام رہا ہے۔ عزیز احمد نے "خدنگ جستہ" میں تیمور کے زخمی پاؤں کو موضوع بنا کر انسان کی بے بسی کا جو متاثر کن خاکہ پیش کیا تھا وہ تاثر سلیم احمد تیمور کی موت سے بھی پیدا نہ کر سکے۔ حالانکہ ڈرامے میں تاثر آفرینی کی گنجائش افسانے کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے۔

خدیجہ مستور نے ڈرامائی انداز پیدا کرنے کی کوشش میں افسانے کے آخری حصے کو غیر فطری اور پُر تصنع بنا دیا ہے۔ .... مضامین میں ممتاز حسن کا مضمون عوامی نقطۂ نظر کا حامل اور

عوام کے لئے ناقابلِ فہم ہے۔ لیکن زبان کی ثقالت سے قطعِ نظر مضمون میں موجودہ دور میں انسانی اور ادبی اقدار کے انحطاط کی بنیادی وجوہات کو سمجھنے اور سمجھانے کی فکر انگیز کوشش کی گئی ہے۔

جمیل جالبی کا مضمون بہادر شاہ ظفر پر اختصار کے باوجود کافی جامع اور اچھا ہے۔

محمد صفدر کا مضمون "اردو ڈرامہ اور روایت" بہت تشنہ رہ گیا۔ انہوں نے جو ICONOCLASTIC باتیں کہی ہیں۔ اُن کا خاطر خواہ اثر تفصیلی مضمون ہی سے پیدا ہو سکتا تھا۔

سوز پر ڈاکٹر محمد اشرف کا مضمون یونہی سا ہے۔ لفظ "کنے" (یعنی "پاس") کے متعلق ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ یہ لفظ اب غالباً "رامپور اور شاہ جہاں پور کے پٹھان خاندانوں سے باہر بہت کم بولا جاتا ہے"۔ لیکن اس لفظ کا استعمال بنگلور اور میسور میں آج بھی عام ہے۔

جوش کا مضمون ان کی "ہیئت بیانی" نثر کا نمونہ ہے

شعری حصے میں چند اک اچھی نظموں کے ساتھ "سکوتِ مضطرب" "دائرے" اور "بہلاوا" جیسی بے حد کمزور نظمیں بھی شامل ہیں۔ جاں نثار اختر کی نظم "آخری ملاقات" اردو کی چند اچھی نظموں میں شمار کی جائے گی اور اسے باآسانی جاں نثار اختر کی بہترین نظم قرار دیا جاسکتا ہے۔

غزلوں کا حصہ بہت ہی بے کیف ہے۔ اثر لکھنوی کی چار غزلیں شامل ہیں اور چار دل اتنی سپاٹ اور پھسپھسی ہیں کہ نام کو بھی ایک شگفتہ اور جاندار شعر نہیں ملتا۔ فراق کی غزلیں بھی کچھ بہتر نہیں ہیں۔ نشور واحدی، احمد ندیم قاسمی، تابش دہلوی، حفیظ ہوشیار پوری اور سلیم احمد کی غزلیں بھی اسی بے رنگی اور بے کیفی کی آئینہ دار ہیں۔ ناظر کاظمی بھی بجھے بجھے ہوئے ہیں معلوم ہوتا ہے ابتدائے شوق کی آگ راکھ ہو چکی ہے۔ ضیا جالندھری، شہرت بخاری اور خلیل الرحمٰن اعظمی کی غزلوں نے اس حصے کی لاج رکھی ہے۔ ساقی فاروقی کی مثنوی "شہرِ عشق" مزاحیہ انداز میں جدید شہر آشوب لکھنے کی کامیاب کوشش ہے۔

زیرِ نظر شمارے کا ایک حصہ سارتر کے لئے مختص کر دیا گیا ہے۔ جس میں سارتر کے ایک افسانے مضمون اور ڈرامے کے تراجم شامل ہیں۔ ادارے نے سارتر کا اور جمیل جالبی نے اُس کے فلسفے اور نظریات کا تعارف کرایا ہے۔ افسانے ڈرامہ اور مضمون کے تراجم شاہد احمد، سلیم عاصمی اور

انتظار حسین نے کیے ہیں۔ تینوں ترجمے اچھے ہوئے ہیں۔

سارتر کو اردو حلقوں میں متعارف کرانے کی کوشش مستحسن ضرور ہے۔ لیکن تعارف میں غلو کا عنصر بہت زیادہ شامل ہو گیا ہے۔ اداریے نے اور جمیل جالبی نے جو باتیں کہی ہیں اور EXISTENTIALISM کی مداخت میں جس عقیدت اور ذوق و شوق کا مظاہرہ کیا ہے وہ کچھ ضرورت سے زیادہ خوش فہمی کا نتیجہ ہے۔

جدید فکری اور ادبی تحریکات پر سارتر کے نظریات کا اثر اور ان نظریات کی خوبیاں دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ کسی خیال کے دائرۂ اثر کی وسعت لازمی طور پر اس خیال کی صحت اور سچائی کی ضامن نہیں ہوتی۔ نیم صداقت اور مکمل صداقت میں فرق مشکل ہوتا ہے اور اسی مشکل کی وجہ سے اس فرق کی پہچان زیادہ اہم اور ضروری بھی ہو جاتی ہے۔

جمیل جالبی نے اپنے مضمون میں سارتر کے فلسفے کو ذہن نشین کرانے کے لئے جا بجا اردو کے اشعار سے مدد لی ہے۔ شاید وہ اس طرح اردو کے قارئین کے لئے سارتر کے خیالات کو زیادہ قابل قبول انداز میں پیش کرنا چاہتے تھے لیکن یہ طریقہ اس اعتبار سے کافی گمراہ کن بھی ہو سکتا ہے کہ پڑھنے والا مجموعی اعتبار سے میر کے فلسفۂ حیات اور سارتر کی EXISTENTIALISM کو ایک ہی چیز سمجھنے لگ جائے کیونکہ ہمارے یہاں یہ رجحان عام ہے۔ لوگ قرآن مجید میں ٹیلی وژن اور راکٹ کا وجود دریافت کر کے وجد فرماتے ہیں۔

بہرحال معیار کی ناہمواری کے باوجود نیا دور کا یہ شمارہ خریدنے اور پڑھنے کی چیز ہے۔ فی الوقت ادبی رسائل جس نہج اور معیار پر نکل رہے ہیں اس کے پیش نظر تو زیر نظر شمارے سے کوئی شکایت مناسب بھی نہیں ہوگی۔

بازگشت

خطوط کے اقتباسات

- قرۃ العین حیدر
- اختر الایمان
- کرشن چندر
- جذبی
- ڈاکٹر محمد حسن
- شاد عارفی
- اسلوب احمد انصاری
- سہیل عظیم آبادی
- جیلانی بانو
- شفیق فاطمہ شعریٰ
- باقر مہدی
- وحید اختر
- شاذ تمکنت

"یہ لکھنا بڑی رسمی سی بات ہوگی کہ آپ نے بنگلور سے رسالہ نکال کر کمال کر دیا اور آپ کی ہمت قابلِ ستائش ہے وغیرہ۔ سوغات میں نے شروع سے آخر تک پڑھا اور اسے واقعی تعریف کے قابل پایا ہے۔ سوغات میں تراجم کا حصہ بہت اچھا ہے۔ شفیق فاطمہ شعریٰ کون بی بی ہیں۔ میں نے ان کی ایک نظم کہیں اور بھی دیکھی تھی جو بہت اچھی تھی۔ واجدہ تبسم کا افسانہ بہت کمزور ہے۔"

قرۃ العین حیدر

"سوغات مل گیا تھا۔ پرچہ مجھے بے حد پسند آیا۔ 'نیا دور' کے بعد آج آپ نے ہمت کی ہے۔ دوسرا نمبر کب نکل رہا ہے؟ میں اس کے لئے ضرور کوئی تازہ نظم بھیجونگا۔"

اختر الایمان

"سوغات ملا۔ بہت اچھا پرچہ ہے۔ افسانہ لکھنے کے لئے وقت کے ساتھ جدوجہد کر رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ کامیابی ہوگی۔ اور پہلی فرصت میں آپ کو افسانہ بھیج سکونگا۔ میری دُعا ہے خدا آپ کے ارادوں میں کامیاب کرے۔"

(ایک اور خط میں) "سوغات واقعی اردو کیلئے ایک سوغات ہے۔ نعمت غیر مترقبہ ہے۔"

کرشن چندر

"سوغات بھی ملا اور آپ کا خط بھی۔ پرچہ کا معیار اچھا خاصہ ہے۔ لیکن یہ بھی یاد رکھئے کہ آپ اگر معیار کے پیچھے پڑ گئے تو پھر آپ کو وہی مشکلات پیش آئیں گی جن کا ذکر آپ نے سوغات میں کیا ہے۔ تراجم کا سلسلہ جاری رکھئے یہ بہت ہی مفید کام ہے۔"

معین احسن جذبی

"سوغات مل گیا۔ "آفریں باد بریں ہمت مردانۂ تو" والا مضمون ہے۔ سب سے بڑی بات جو

آجکل کے پرچوں میں کم نظر آتی ہے، یہ ہے کہ سوغات کی ہر سطر اور ہر لفظ کے پیچھے ایڈیٹر کی پوشیدہ مگر بلاشک وشبہ موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ سوغات صرف مضامین افسانوں اور غزلوں نظموں کا شیرازہ ہی نہیں بلکہ اور بھی بہت کچھ ہے"

ڈاکٹر محمد حسن

"ذوق مرحوم نے کہا تھا (اپنی پست قدی کے اعتراض کے جواب میں کہا تھا)

پست ہمت یہ نہ ہو اور پست قامت ہو تو ہو

چنانچہ ضخامت کے اعتبار سے سوغات کتنا ہی "چھر یرا" ہو مگر بہ اعتبارِ قوت "اچھے اچھوں سے ہاتھ ملا سکتا ہے (میرا مطلب ہے آنکھ ملا کر بات کر سکتا ہے) واقعی بنگلور جیسی جگہ سے ایسا "معنی خیز" رسالہ اور وہ بھی ادبی قابلِ داد ہے۔ کسی معاملہ بند شاعر نے اپنے محبوب کو بچپن ہی میں دیکھ کر یہ شعر کہا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں اگر سنجیدگی کے ساتھ یہ شعر سوغات پر چپکا دوں تو سوغات کی تمام شاب آفرینیاں سامنے آجائیں گی۔ ے

بچپن ہی میں دیکھا تھا ظالم تو یہ سمجھے تھے ڈھائیگی ستم اک دن ظالم تری رعنائی

یہ شعر چاہے کتنا ہی گھٹیا اور تیسرے درجہ کا ہی مگر یہاں اس کا استعمال ایک حد تک نہیں بلکہ سو فیصدی درست ہوا ہے۔ گٹ اپ وغیرہ کے بارے میں "سادگی و پرکاری" والی ترکیب درست آتی ہے۔ ایسے ہی موقعوں اور سادہ پرکاروں کو دیکھ کر غالب مرحوم کو "لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں" جیسے مصرعے سوجھتے تھے"۔

شاد عارفی

"پرچہ کا سرورق دیکھ کر طبیعت بے حد خوش ہوئی۔ مضامین وغیرہ بھی اچھے ہیں۔ خصوصاً ایڈون جیور کا مضمون بہت اچھا ہے۔ آپ کی غزل اور نظم دونوں۔ خاص طور پر نظم مجھے پسند آئی۔ گو نظم کا حصہ بحیثیت مجموعی اچھا نہیں۔ آپ کی کوشش قابلِ داد ہے۔

میں نے ۲۹ مارچ کو اردو ادب کی رفتار پر جو تبصرہ آل انڈیا ریڈیو دہلی سے کیا اس میں سوغات

کا ذکر بھی کیا تھا۔ چونکہ تقریر صرف دس منٹ کی تھی اور کافی مواد کو سمیٹنا تھا اس لئے زیادہ تفصیل سے ذکر کرنا ممکن نہ تھا"

اسلوب احمد انصاری

"سوغات میں نے کہیں کہیں سے پڑھا ہے۔ ظاہری شکل و صورت بہت پسند آئی۔ سادہ ہے اور پھر بھی بہت دلکش۔ مضامین کے بارے میں تفصیل سے لکھنا ہوگا۔ اگرچہ مضامین اچھے ہیں۔ البتہ جزوی اختلافات کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے۔ اور اس کے لئے ہر صاحب فکر کو تیار رہنا چاہیئے۔ یہ کوئی بری بات نہیں۔"

سہیل عظیم آبادی

'ہندوستان میں سوغات کی طرح خوبصورت پرچے بہت کم شائع ہوئے ہیں۔ خصوصاً ٹائٹل تیج بہت سادہ و پرکار ہے۔ مضامین، افسانے، اور نظمیں ہر چیز معیاری ہے۔ خصوصاً ترجموں پر بہت محنت کی گئی ہے۔'

جیلانی بانو

'سوغات پاکے بڑی خوشی ہوئی۔ آپ کی ادارت میں ایسے رسالے کا نکلنا کوئی خلاف توقع بات نہیں ہے۔ بنگلور تو بنگلور آپ اگر لنکا سے بھی رسالہ نکال لیتے تو اس کے معیار کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ لیکن سچ بات کہدوں کہ میں صرف مواد کی حد تک پر امید تھی۔ ایسا دیدہ زیب سرورق تو میرے خواب و خیال میں بھی نہ آیا تھا۔

جب ہندوستان سے کوئی وقیع اور خوبصورت رسالہ نکلتا ہے تو مجھے اتنی خوشی ہوتی ہے جتنی عید آنے پر ہوتی ہے۔ آپ کہیں گے چھپنے کے لالچ میں خوشی ہوتی ہوگی۔ ایسا نہیں ہے۔ اگر اس میں نہ چھپوں تب بھی خوشی ہوگی۔ اس لئے کہ اس رسالہ کی وجہ سے ذرا ہمارا سر پاکستان والوں کے سامنے اونچا ہوا ہے۔ ورنہ ویسے تو "لوگ ہمیں پھوہڑ اور بے سلیقہ سمجھتے ہونگے۔" شفیق فاطمہ شعریٰ

پرچہ دیکھکر طبیعت خوش ہو گئی۔ ٹائٹل جس قدر حسین ہے۔ اتنا ہی ثقہ بھی ہے۔ مواد کے لحاظ
سے پرچہ وقیع ہے۔ آپنے بہت اچھا کیا جو مضامین کے حصہ میں تین تراجم دے دیے میں سمجھتا ہوں کہ
راجم سے ہمارے ادب کی بڑی خدمت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ مغرب کی اکثر تحریکوں سے خواہ وہ آرٹ کی
ہوں یا فلسفہ کی ہمارے لکھنے والے بہت کم واقف ہیں۔ جس کی وجہ سے ان مسائل پر جب بھی گفتگو ہوتی
ہے تو بہت ہی سطحی۔ اس طرح کے ترجموں سے نہ صرف اردو ادب کی خدمت ہوتی ہے بلکہ ان ادیبوں کی
بھی جو پڑھنے کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کیلئے سم قاتل سمجھتے ہیں"

وحید اختر

"آج کے حیران کن دور میں سوغات کا اجرا کوئی کارنامہ ہو یا نہ ہو۔ لیکن یہ چند اُمیدیں ضرور پیدا
کرتا ہے۔ اور ایک ادبی پرچہ اس سے زیادہ ان حالات میں کر بھی کیا سکتا ہے۔ پرچہ سلیقہ اور
نفاست کے ساتھ اچھا خاصا فکر خیز مواد پیش کرتا ہے۔ مجھے ترجمے بہت پسند آئے۔ خاص کر ہنری مل
کا۔ اگر ذہن کو یکسوئی نصیب ہوتی تو میں اس سمپوزیم میں ضرور حصہ لیتا۔
حصۂ نظم میں شعری کی نظم "فصل نیک فال" مجھے بہت پسند آئی۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس حصہ
کی سب سے اچھی (میرے خیال سے) اور کمزور دونوں نظمیں انہیں کی ہیں۔ "الجبرا" شعری اعتبار سے
بڑی سپاٹ نظم ہے۔ شاید سیاسی موضوعات ان کے لئے موزوں نہیں۔ ان کی غزل کے بھی ایک دو شعر
بڑے ترشے ہوئے ہیں۔ آپ کی غزل میں وہ بات نہیں جو ایک اور غزل میں تھی۔ جس کا یہ شعر مجھے ابتک یاد ہے

یاد رکھو تو دل کے پاس ہیں ہم
بھول جاؤ تو فاصلہ ہے بہت

البرٹ کامیو کا ترجمہ غنیمت ہے۔ اگرچہ اس کلاس سے اچھا ناول THE FALL ہے جس
میں اس کا فلسفہ IDEA OF ABSURD پوری طرح ابھر آیا ہے۔
افسانے مجھے پسند نہیں آئے۔ واجدہ تبسم کا افسانہ ایک طویل مکالمے کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔
مجھے ان کے چند افسانے پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اور ہر بار یہی خیال آیا کہ ان میں بہت ساری غیر ضروری
باتیں آجاتی ہیں۔ جو پلاٹ کی روانی کو تقریباً ختم کر دیتی ہیں۔ اور ان کا موضوع بھی بہت فرسودہ ہوتا ہے

ہے.......... تبصروں میں مجھے محمد حسن کا مضمون پسند آیا۔ یقین جانئے یہ کسی قسم کا مبالغہ نہیں ہے کہ سوغات اپنے معنی کی پوری ذمہ داری کو محسوس کرتا ہے۔ اور سب سے بڑی بات کہ آپ اُسے اور اچھا بنانے میں کوشاں ہیں۔ اس سعی پیہم کے لئے مبارکباد قبول کیجئے۔"

باقر مہدی

"مرحوم "نیا دور" کے بعد بنگلور سے ایسا خوبصورت اور خوب سیرت پرچہ نکالنا آپ جیسے باذوق ہی کا کام تھا۔ آپ "منہ دیکھی" بات نہ سمجھیں آپ کا رسالہ واقعی اچھا ہے۔ اور اس کے لئے لکھ کر ہر ادیب کی "لنا" کو تسکین ہوگی۔"

شاذ تمکنت

بقیہ صفحہ ۸۴ کا .... بات جو مشترک اور قابلِ لحاظ ہے وہ ہے میٹھی اور چھی تلی زبان۔ حالی نے توضیح EXPOSITION اور خطابت دونوں کے لئے جو زبان استعمال کی ہے وہ عام بول چال کی زبان ہے۔ جو ضامی اور علمیت کے بوجھ سے گرانبار نہیں اس میں وہ شیرینی، رچاؤ اور گھلاوٹ ہے۔ جو ابلاغ کے مقصد کو بخوبی پورا کرتی ہے۔

حالی کی تجدیدی کوششوں کا ایک پہلو ان کی سوانح عمریوں میں بھی نظر آتا ہے حیاتِ جاوید کو شبلی نے کتاب المناقب کہا ہے موجودہ معیار پہ یہ سوانح عمری بیشک پوری نہیں اترتی کیونکہ اس میں سرسید کی شخصیت کے بعض پہلو تشنہ رہ گئے ہیں لیکن پھر بھی یہ بڑا ادبی اور علمی کارنامہ ہے کیونکہ اس میں سرسید اور ان کے عہد کو مسلمانوں کی ذہنی زندگی کے پس منظر میں اتنے ضخیم مواد کی ترتیب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے حالی کی دلچسپی شخص میں شاید اتنی نہیں ہے جتنی ماحول اور پس منظر میں "حیاتِ سعدی" اور "یادگارِ غالب" میں سعدی اور غالب دونوں کی زندگی اور کلام پر جیسا متین اور منصفانہ محاکمہ کیا گیا ہے وہ اپنی جگہ لائقِ تحسین ہے غالب کے کلام کی ایسی جامع تشریح اب تک نہیں کی گئی۔ یہ اور بات ہے کہ اب غالب پر تنقید کا زاویہ بہت کچھ بدل گیا ہے۔

حالی نقادِ فن کی حیثیت سے مقدمۂ شعر و شاعری میں سامنے آتے ہیں! ادب اور خاص طور پر شاعری کے میدان میں روایت اور تجربہ کی آویزش کو حالی نے تخلیقی طور پر جس طرح برتا تھا۔ مقدمہ کو اس کا اصولی جواز کہئے۔ مقدمہ کی تاریخی حیثیت بہت اہم ہے کیونکہ حالی پہلے شخص ہیں جنہوں نے ادبی مسلمات سے بحث کی ہے۔ شعر کی تعریف ادب اور سماج کا رشتہ ادبی اسالیب میں تبدیلیاں اور ان کا اجتماعی پس منظر تخیل اور قوتِ فیصلہ کی حدیں۔ تجربات کی نوعیت اور ان کے امتیازات اردو میں عربی فارسی اور ہندی بھاشا کی آمیزش، ان سب پر حالی نے بحث کی ہے! اور ایسی باتیں کہی ہیں۔ جو ان کے عہد کو ذہن میں رکھتے ہوئے نئی اور خیال انگیز ہیں۔ پھر ان مسلمات کی روشنی میں غزل قصیدہ اور مثنوی کے خوب و زشت کو پرکھا ہے۔ ان بحثوں سے چند نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ حالی ادب کو جامد شے نہیں سمجھتے۔ زندگی اور ادب کے باہمی تفاعل پر زور دیتے ہیں۔ ادب میں واقعیت، حسنِ تعمیر اور حسنِ بیان کو یکساں اہمیت دیتے ہیں۔ ادب اور شاعری کو اظہارِ ذات سے زیادہ قومی شعور کے عکس اور انفرادی مسرت سے بڑھ کر اجتماعی مسرت اور مفاد کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ ادب میں نئے تجربات کے حق میں ہیں۔ اور فن کو منتہائے مقصود قرار دینے کی بجائے اُسے مشاہدہ، بصیرت اور اجتماعی مقاصد کے

تابع کرنا چاہتے ہیں۔ مدس کو ادب اور تنقید کے جدید ترین فلسفیانہ، جمالیاتی یا عمرانی نظریوں کی کسوٹی پر جانچنا صریح غلطی ہے۔ مدس ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اِس میں پہلی بار تنقیدی مسائل کو مدلل سائنٹفک اور قطعی نثر میں پیش کیا گیا ہے۔ حالی ایک مجدد اور نقادِ فن کی حیثیت سے اِس لئے اہم ہیں۔ کیونکہ وہ روایت کی گود میں پلے تھے۔ اجتماعی زندگی کی تبدیلیوں اور قومی جذبات کی آنچ کو محسوس کرتے تھے۔ اور ادب کو زندگی کے بڑے مقاصد کا خادم بنانا چاہتے تھے۔ وہ ادبی دھائے کا رُخ موڑ دینے میں پوری طرح کامیاب ہوئے اور انہوں نے نظم اور نثر دونوں میں تجدید کی رُوح پھونکی اور نئے ادبی شعور کا آغاز کیا۔